کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، مگر پھر بھی انھوں نے چونکہ اس موضوع پر کافی محنت کی ہے، اور کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، اس لئے اس بارے میں ان کی رائیں بے وزن نہیں ہیں۔

انتخابات اردو، صفحات ۶۴ کتابت و طباعت معمولی ناشر دوارا اینڈ کمپنی پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی ۲ قیمت ۱/ عہ

اردو نثر و نظم کے جو مختلف منتخب مجموعے اسکولوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں ان میں انتخابات اردو بھی ہے، جسے گجرات سرٹیفکٹس اگزامیشن بورڈ نے مرتب کرایا ہے، نثر میں میرامن سے لیکر ہندر ناتھ تک کے مضامین کا انتخاب شامل ہے، اسی طرح نظم میں ولی گجراتی سے لیکر آنند نرائن ملا تک کے کلام کے نمونے شامل ہیں، تعجب ہے کہ اردو کی سب سے قدیم صنف حمد و نعت کے نمونے اس میں شامل نہیں ہیں، منظومات میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کو نظر انداز کر دینا بھی تعجب خیز معلوم ہوا، یہ انتخاب مکمل تو نہیں کیا جاسکتا مگر مفید ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے،

جماعت اسلامی کے نظریات و افکار از مولانا عبدالصمد رحمانی، صفحات ۵۶، کتابت اشاعت اعلیٰ ناشر دار التالیف مانڈ ضلع مونگیر

قیمت ۵۰ پیسے

جماعت اسلامی کے نظریات و افکار کے بارے میں پہلے بہت سے چھوٹے بڑے رسالے شائع ہوچکے ہیں، انہی میں یہ رسالہ بھی ہے، مگر اس ازمودودیت کی مہم سے نہ تو ان لوگوں کے خیال کے مطابق جماعت اسلامی کی اصلاح ہوئی اور نہ اس سے عام مسلمانوں کو کوئی تعمیری فائدہ پہنچا، اس کتاب میں جتنے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، ان سب کی تاویل و توجیہ ہوسکتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا کہ مودودی صاحب کا قلم کہیں کہیں جادہ ادب سے ہٹ گیا ہے، مگر اس سے اس کے اصول و مقاصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور قابل بحث بھی جزئیات ہیں، کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت مودودی صاحب کی کتابوں سے اقتباسات جمع کر دئے گئے ہیں،

(م ج)

جلد ۹۳۔ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۴ء۔ عدد ۵

مضامین

مقالات

انباء علمیہ و ادبیہ

شذرات

گذشتہ مہینے ہم نے ہندوستان کی حکومت سے کچھ صاف صاف باتیں کہی تھیں، اس مہینہ اسی صفائی سے پاکستان سے چند باتیں کہنا ہیں، ہندوستان کی حکومت خالص دنیاوی ہے اور اس پر صرف دنیاوی قانون کی حیثیت سے اپنی اقلیتوں کی ذمہ داری ہے، اگر وہ ان کو پورا نہیں کرتی تو اس کو کسی بالاتر قوت کے مواخذہ کا خوف نہیں ہے لیکن پاکستان اسلامی حکومت کا مدعی ہے اور اسلام میں غیر مسلموں کے بارہ میں اسلامی حکومت کی بڑی ذمہ داریاں ہیں، اور ان ذمہ داریوں کا اس کو خدا کے سامنے جواب دینا ہے، اس لیے غیر مسلم محکوموں کے ساتھ حسن وسلوک اسلامی حکومتوں کی روایت رہی ہے جس کو انھوں نے اس زمانہ میں بھی قائم رکھا ہے، اسلامی حکومتیں پورے ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور عرب کے علاوہ ان سب میں غیر مسلم اقلیتیں ہیں، جو مسلمانوں کی طرح امن وسکون اور عزت ووقار کی زندگی بسر کر رہی ہیں، ان میں سے کسی کو بھی اپنی حکومتوں سے بدسلوکی کی شکایت نہیں ہے، ایسی حالت میں پاکستان کا اس روایت کو توڑنا اس کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔

اس کا فرض تو یہ تھا کہ اپنی اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایسا نمونہ پیش کرتا جس سے دوسرے سبق حاصل کرتے اور اسلام اور مسلمانوں کی طرف ان کا دل کھنچتا، نہ کہ الٹے ان سے نفرت پیدا ہو، اس لیے اقلیتوں کے ساتھ زیادتی نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی جرم بھی ہے، ردعمل کا عذر خواہ کسی حد تک

فطری کیوں نہ ہو لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر لغو ہے، کسی بے گناہ سے محض اس بنا پر کہ وہ کسی مجرم کا ہم قوم اور ہم مذہب ہے، بدلہ لینا ایک وحشیانہ تصور اور اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے، یہ تو اس مسئلہ کا مذہبی پہلو ہے، سیاسی پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان گو دستوری لحاظ سے ہندوستان کے شہری ہیں، اور ان کو وہ سارے حقوق حاصل ہیں جو یہاں کی اکثریت کو حاصل ہیں اور حکومت کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے، لیکن فرقہ پرست جماعتیں ان کو اجنبی اور پاکستان کا یرغمال سمجھتی ہیں، ان کو ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود گوارا نہیں اور وہ جھوٹے جھوٹے الزام تراش کر ان کو مٹانا چاہتی ہیں، اگر پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ کوئی ناگوار واقعہ پیش آجاتا ہے تو ان کو ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ہے اور اس کا بدلہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے لیتی ہیں، اور اکثریت کے عوام کا بھی ان حالات سے متاثر ہوجانا ایک حد تک فطری ہے، اس لیے حکومت بھی ان کے مقابلہ میں بے بس ہوجاتی ہے،

ہندوستان کی تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی حیثیت یونہی ختم ہوگئی ہے، اگر دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار رہتے اور پاکستان کی اقلیتیں مطمئن ہوتیں تو کم از کم مسلمان امن وسکون کی زندگی بسر کرلیتے اور آیندہ ان کے پنپنے کی کوئی راہ نکلتی لیکن دونوں ملکوں کی کشاکش نے ان کو امن وسکون سے بھی محروم کردیا ہے، گو انشاء اللہ ان حالات میں بھی وہ اپنا وطن نہ چھوڑیں گے اور اسلام کا نام یہاں سے نہ مٹنے دیں گے اور ایک نہ ایک دن یہ دور ابتلا ختم ہوگا، لیکن اگر بالفرض ان حالات سے گھبرا کر وہ ہندوستان چھوڑنا بھی چاہیں تو کون ملک پانچ کروڑ انسانوں کا بار اٹھائے گا، اس لیے مسلمانوں کو بہر حال ہندوستان ہی میں رہنا ہے، اور اپنی ہمت، استقلال اور تدبر و ہوشمندی

ے ملک میں اپنا اعتبار پیدا کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا ہے، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی، خصوصاً پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ اس کے سلوک کا مسئلہ ہے، پاکستان کو اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ واقعی ہمدردی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں کوئی ایسی شکل نہ پیدا ہونے دے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات و مصائب میں اور اضافہ ہو، اور ان پر ہندوستان کی سرزمین تنگ ہو جائے، خصوصاً اپنی اقلیتوں کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، جو نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی ذمہ داری بھی ہے

یہ تنہا ہندوستانی مسلمانوں یا ہندوپاک کی اقلیتوں کا نہیں بلکہ انسانیت کا مسئلہ ہے، آخر دونوں ملکوں کی اقلیتیں کب تک مصائب میں مبتلا اور امن و سکون کی زندگی سے محروم رہیں گی، ان سے کہیں بہتر ان ملکوں کے جانوروں کی زندگی ہے، ہندوستان اور پاکستان کے اختلاف کا نتیجہ دونوں ملکوں کی تباہی ہے، انکی توانائیوں کا بڑا حصہ ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف ہونے کے بجائے ایک دوسرے کی مدافعت کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے، مغربی طاقتیں الگ ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھا رہی ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں لیکن وہ مختلف طبعی اور فطری رشتوں سے ایک دوسرے سے اسقدر منسلک ہیں کہ ہمیشہ کیلئے جدا نہیں رہ سکتے، ان کو بہرحال ایک ایک دن اپنے اختلافات کو ختم کرنا ہے اس لیے دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ جو واقعہ ایک دن ہونے والا ہے اس کے لیے بعد از خرابی بسیار کا کیوں انتظار کیا جائے۔ ابھی حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی یہی خیال پارلیمنٹ میں ظاہر کیا ہے اور یہی صحیح طریقہ فکر ہے، اس لیے پاکستان کو بھی اسی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے

(سلسلہ کیلئے دیکھو معارف ماہ نومبر ۱۹۶۲ء)

(۹)

اشاعت اسلام

ہندوستان کے سلاطین نے اشاعت اسلام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، چنانچہ جہاں جہاں انکے دار السلطنت رہے، وہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے بجائے کم ہی رہی، انصاف پسند ہندو مورخین بھی اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ جب فتح و کامرانی کا جوش و خروش ختم ہو جاتا اور ملک میں اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے بڑے پُرجوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، اسی لیے انھوں نے کبھی اسکی فکر نہیں کی کہ ہندو زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمان بنا کر اسلام کے دائرہ کو وسیع کریں، دوآبہ میں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس رہی، بہار اور دکن میں بھی وہ آٹھ سو برس تک حکمراں رہے، لیکن ان علاقوں میں انکی آبادی ۱۵ فیصدی سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

برطانوی دور حکومت میں انگریز مورخین اور انکے مقلدوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہوا دینے کیلئے اس پر زیادہ زور دیا کہ فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، عالمگیر، حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا، اور اسکے ثبوت میں تاریخ اور قرائن سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہادتیں بھی فراہم کی گئیں، اگر وہ واقعی ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کرتے تو کم از کم انکے پایۂ تخت کے ارد گرد ہندوؤں کی زیادہ آبادی نہ ہوتی، لیکن انکے عہد سے ابتک وہاں ہندو اپنے دیرینہ رسوم و رواج کے ساتھ اکثریت میں ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان حکمرانوں کے عہد میں کچھ راجپوت اور دوسری ذات کے ہندو مسلمان ضرور ہوئے، لیکن وہ زیادہ تر جاہ و اقتدار اور دنیاوی مفاد کی خاطر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، خود فیروز شاہ تغلق نے فتوحات فیروز شاہی میں لکھا ہے اس نے غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب کیلئے یہ

ے ملک میں اپنا اعتبار پیدا کرکے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا ہے، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی، خصوصاً پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ اس کے سلوک کا مسئلہ ہے، پاکستان کو اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ واقعی ہمدردی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں کوئی ایسی شکل نہ پیدا ہونے دے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات و مصائب میں اور اضافہ ہو، اور ان پر ہندوستان کی سرزمین تنگ ہو جائے، خصوصاً اپنی اقلیتوں کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، جو نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی ذمہ داری بھی ہے

یہ تنہا ہندوستان یا ہندو پاک کی اقلیتوں کا نہیں بلکہ انسانیت کا مسئلہ ہے، آخر دونوں ملکوں کی اقلیتیں کب تک مصائب میں مبتلا اور امن و سکون کی زندگی سے محروم رہیں گی، ان سے کہیں بہتر ان ملکوں کے جانوروں کی زندگی ہے، ہندوستان اور پاکستان کے اختلاف کا نتیجہ دونوں ملکوں کی تباہی ہے، انکی توانائیوں کا بڑا حصہ ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف ہونے کے بجائے ایک دوسرے کی مدافعت کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے، مغربی طاقتیں الگ ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھا رہی ہیں ہندوستان اور پاکستان میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں لیکن وہ مختلف طبعی اور فطری رشتوں سے ایک دوسرے سے اسقدر وابستہ ہیں کہ ہمیشہ کیلئے جدا نہیں رہ سکتے، ان کو بہرحال ایک نہ ایک دن اپنے اختلافات کو ختم کرنا ہے اس لیے دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ جو واقعہ ایک دن ہونے والا ہے اس کے لیے بعد از خرابی بسیار کا کیوں انتظار کیا جائے۔ ابھی حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی یہی خیال پارلیمنٹ میں ظاہر کیا ہے اور یہی صحیح طریقہ فکر ہے، اس لیے پاکستان کو بھی اسی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے

(سلسلہ کیلئے دیکھو معارف ماہ نومبر ۱۹۶۳ء)

(۹)

اشاعت اسلام

ہندوستان کے سلاطین نے اشاعت اسلام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، چنانچہ جہاں جہاں انکے دار السلطنت رہے، وہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے بجائے کم ہی رہی، انصاف پسند ہندو مورخین بھی اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ جب فتح و کامرانی کا جوش و خروش ختم ہو جاتا اور ملک میں اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے بڑے پُرجوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، اسی لیے انھوں نے کبھی اسکی فکر نہیں کی کہ ہندو زمیندار اور کاشتکاروں کو مسلمان بنا کر اسلام کے دائرہ کو وسیع کریں، دوآبہ میں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس رہی بہار اور دکن میں بھی وہ آٹھ سو برس تک حکمراں رہے لیکن ان علاقوں میں انکی آبادی ۱۵ فیصدی سے زیادہ نہ بڑھ سکی،

برطانوی دور حکومت میں انگریز مورخین اور انکے مقلدوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہوا دینے کیلئے اس پر زیادہ زور دیا ہے کہ فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، عالمگیر، حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا، اور اسکے ثبوت میں تاریخ اور فرامین سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہادتیں بھی فراہم کی گئیں، اگر وہ واقعی ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کرتے تو کم از کم انکے پایۂ تخت کے ارد گرد ہندوؤں کی زیادہ آبادی نہ ہوتی، لیکن انکے عہد سے ابتک وہاں ہندو اپنے دیرینہ رسوم و رواج کے ساتھ اکثریت میں ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان حکمرانوں کے عہد میں کچھ راجپوت اور دوسری ذات کے ہندو مسلمان ضرور ہوئے، لیکن وہ زیادہ تر جاہ و اقتدار اور دنیاوی مفاد کی خاطر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، خود فیروز شاہ تغلق نے فتوحات فیروز شاہی میں لکھا ہے اس نے غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب کیلئے یہ

منادی کرادی تھی کہ جو شخص اسلام قبول کرے گا وہ جزیہ سے بری سمجھا جائیگا، اس اعلان پر کثرت سے غیر مسلم روزانہ ہر طرف سے آتے تھے اور اسلام قبول کرکے انعام واکرام سے مالا مال ہوکر واپس جاتے تھے، مثلو ں کے زمانے میں اودھ کے بچگوتی راجپوت، بلند شہر کے لال خانی راجپوت، مرزا پور کے گہروار راجپوت اور اعظم گڈھ کے گوتم راجپوت اپنی خوشی سے اس لیے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس سے مذہبی برتری کے علاوہ ان کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالت بھی بلند اور مستحکم ہو جائے گی،

اشاعت اسلام کے سلسلہ میں علمار کی خدمات ضرور ہیں، لیکن وہ اس لیے زیادہ نمایاں نہیں ہیں کہ ان کی کوششوں کا ذکر تاریخوں میں محض سرسری طور پر آتا ہے، البتہ اس سلسلہ میں عرب تاجروں اور صوفیوں نے جو کوششیں کیں اس کی پوری تفصیل ملتی ہے، عرب تاجر جنوبی ہند میں پہنچے تو بڑی خاموشی سے اسلام کا پیام اس علاقہ میں پہنچایا، ملابار، گجرات، کچھ اور جزائر ہند میں اچھوتوں کو بہت ذلیل سمجھا جاتا تھا، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ برہمن سے چوہتر قدم دور رہیں، اس سے زیادہ قریب آنے کی جرأت نہ کریں، اور جب راستہ چلیں تو پکارتے جائیں تاکہ لوگ ان سے دور ہٹ جائیں، اگر کوئی اونچی ذات کا ہندو ان سے چھو جاتا تو جب تک وہ غسل نہ کرتا، کھا نہیں سکتا تھا، اگر کھا لیتا تو برادری سے خارج سمجھا جاتا اور نیچ ذاتوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا، اور اس کی بقیہ عمر غلامی میں بسر ہوتی یا وہ بھاگ کر دوسری جگہ چلا جاتا تھا، عرب تاجر ایسے لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیتے اور جب وہ مسلمان ہوکر دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کر لیتے تو دوسرے ہندو بھی ان کی عزت میں کمی نہیں کرتے تھے، یہ دیکھکر اچھوتوں کے مظلوم فرقوں کی رغبت اسلام کی طرف بہت بڑھ گئی، اس طرح اسلام اپنی اخوت اور مساوات سے اپنا راستہ خود صاف کرتا گیا، اور نیچ ذات والوں کے دلوں پر قبضہ کرتا ہوا رفتہ رفتہ راجاؤں کے قلوب تک پر قابض ہو گیا، ملابار میں جتنے عرب تاجر آتے تھے، وہاں کے باشندوں کے ساتھ کچھ ایسا برتاؤ

رکھتے کہ ہندوؤں کی حکومت میں بھی ان کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوتی، ہندو راجہ ان کی سرپرستی اسلیے بھی کرتے کہ ان کی تجارت سے ان کے یہاں کا بازار گرم رہتا، اور بہت سی چیزیں آسانی سے میسر آجاتیں، اور وہ ان کی تبلیغ اسلام میں بھی مزاحمت نہ کرتے تھے، چنانچہ ان کے عقائد وعبادات کو دیکھ کر ملابار کے چیرامن پیرومن کا آخری راجہ بطیب خاطر مشرف بہ اسلام ہوگیا، اس کی راجدھانی کوڈنگیلور تھی، اس نے ایک عرب کو اپنے یہاں بلاکر کنانور کا راجہ بنا دیا تھا، کالی کٹ کا زمورن بھی عرب تاجروں کی بڑی قدر کرتا تھا، اسی کے زمانہ میں ایک عرب تاجر نے اس کے حدود سلطنت میں ایک بازار قائم کیا، جو بعد میں کالی کٹ کی ایک خوشحال بندرگاہ بن گئی، یہ تاجر یہاں کا قاضی بھی مقرر ہوا، اس کے جانشین زمورن کی حمایت میں ناڈ کے راجہ کے خلاف برابر لڑتے رہے، یہانتک کہ زمورن کا اقتدار جنوبی ملابار میں بھی ختم ہوگیا، زمورن مسلمانوں کا بڑا خیال رکھتا تھا، اور اسلام کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کرتا تھا، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کے حدود سلطنت کے ملاحوں کے ہر خاندان سے ایک مرد مسلمان ہو جائے، یہ نو مسلم جہازوں میں بھرتی ہوتے تھے، جو زمورن کی جنگی مہموں میں کام آتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کس عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، کولتری کا راجہ کا ایک وزیر نایر تھا، جو خود مسلمان ہوگیا اور آگے چل کر کنانور کا راجہ ہوا۔

ہندوستان کے مشرقی ساحل پر بھی عرب تاجر دسویں صدی میں پہنچ چکے تھے، وہ یہاں بلا تکلف شادی بیاہ کر لیتے، جس سے ان کی آبادی بڑھتی رہی، اور ان کی معاشرت اور عبادت کو دیکھ کر وہاں کے اصلی باشندے متاثر ہوتے اور اسلام قبول کرتے رہے،

اشاعت اسلام میں صوفیوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے، مدورا اور ترچنا پلی میں حضرت ناتھڈ ولی (المتوفی ۱۰۳۹ھ ۴۳۳ھ) کی وجہ سے اسلام پھیلا، وہ ایک ترکی شہزادے تھے، اور ریاست وامارت چھوڑ کر درویش بن گئے، اور حجاز، ایران اور شمالی ہند کی سیاحت کرکے ترچنا پلی پہنچے، اور اپنے زہد، عبادت اور اخلاق سے وہاں کے لوگوں کو ایسا متاثر کیا کہ بہت سے ہندو ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے،

ان کا مزار ترچنا پلی میں ہے، ان کے جانشین سید ابراہیم شہید (المتوفی ۵۶۴ھ/۱۱۶۸ء) تو بارہ برس تک اس علاقے کے حکمراں بھی رہے، ان کا مزار ارواڈی میں ہے، حضرت ناتھڑ ولی کے ایک دوسرے مرید اور خلیفہ بابا فخر الدین (المتوفی ۵۶۴ھ/۱۱۶۸ء) نے پینو کونڈا کے راجہ کو مسلمان کیا، مدورا میں اشاعت اسلام حضرت علی یار شاہ کے ذریعہ ہوئی جو گیارہویں صدی عیسوی میں بغداد سے بابا ریحان کی ایک جماعت کے ساتھ بھروچ آئے، اور وہاں کے راجہ کے لڑکے کو مسلمان کیا، نور الدین ستاگر نے گجرات کے کنبیوں کوریوں اور کھارواؤں میں اشاعت اسلام کی، اور سب کو مسلمان بنایا، جو اسماعیلی عقائد رکھتے ہیں، ۱۳۰۴ء میں عرب واعظین میں ایک مبلغ پیر مہابر کھندایت کے نام سے مشہور ہوئے، بیجاپور آکر وہاں کے کاشتکاروں کو مسلمان کیا، چودھویں صدی میں حضرت خواجہ گیسو دراز نے پونہ اور بلگام کے ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ کی، کوکن میں حضرت عبد القادر جیلانی کی نسل کے ایک بزرگ شیخ بابا عجب نے اسلام پھیلایا، اور وہ وہانوں میں مدفون ہیں، دھوار کے اضلاع میں حضرت ہاشم پیر گجراتی کے ذریعہ اسلام پھیلا، ستارا کے علاقہ میں ایک نو مسلم پیر شمپوا باکوشی نے وہاں کے لوگوں کو مسلمان کیا، بارہویں صدی عیسوی میں ایک بزرگ سید احمد سلطان سخی سرور المعروف بہ لکھی داتا (المتوفی ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء) نے شاہ کوٹ متصل ملتان میں آکر قیام کیا، اور ہندو مسلمان دونوں ان کے معتقد ہوئے، ان کے پیرو سلطانی کہلاتے ہیں، اور پنجاب خصوصاً جالندھر میں بہت ہیں، راجستھان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذریعہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا اور حضرت دہلی سے اجمیر کے راستے میں انھوں نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا، پنجاب کا مغربی حصہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی اور حضرت فرید الدین گنج شکر (المتوفی ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) کے فیوض سے سیراب ہوا، جواہر فریدی میں ہے کہ بابا گنج شکر نے پنجاب کی گیارہ قوموں کو تعلیم و تلقین سے مشرف بہ اسلام کیا، حضرت بو علی قلندر (المتوفی ۷۲۴ھ) نے پانی پت میں تین سو راجپوتوں کو مسلمان کیا، کشمیر میں شاہ مرزا بلبل شاہ، سید علی ہمدانی (المتوفی ۱۳۸۴ء

اور میر شمس الدین عراقی کی وجہ سے اسلام کو فروغ حاصل ہوا، بہار میں فردوسیہ سلسلہ کے بزرگ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں لگے رہے، پندرہویں صدی عیسوی میں جب بنگال کے راجہ کنس کے بیٹے جٹ مل نے اسلام قبول کیا تو اسکے اثر سے کثرت سے ہندو مسلمان ہوئے، وہاں عام طور سے متمول مسلمان قحط کے زمانے میں ہندوؤں کے بچوں کو خرید لیتے اور انکی تعلیم و تربیت اسلامی طریقہ پر کرتے، جب حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ شیخ اخی سراج الدین (المتوفی ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء) اور انکے خلیفہ شیخ علاء الحق (المتوفی ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء) نے بنگال میں قیام کیا اور توحید و رسالت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی مساوات بھی پھیلائی تو اسکے اثر سے وہاں کے نیچی ذات کے ہندو جو خود ہندوؤں میں ذلیل نظروں سے دیکھے جاتے تھے، بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، سلہٹ میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پیر بھائی شیخ جلال الدین تبریزی (المتوفی ۶۲۳ھ/۱۲۲۵ء) نے اسلام کی اشاعت کی، ان کا مزار سلہٹ میں ہے،

اشاعت اسلام کا روشن اور تاریک پہلو

اشاعت اسلام سے مسلمانوں کی تعداد ضرور بڑھ گئی، گو جس سرعت سے عراق، شام، مصر اور ایران میں اسلام پھیلا، ہندوستان میں نہ پھیل سکا، پھر بھی مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی، مبلغوں نے غیر مسلموں کو مسلمان تو ضرور بنا دیا، مگر ان کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان میں اسلامی اعمال و اخلاق اور اسلامی کردار پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، خود پشتینی مسلمان بھی بڑی حد تک اسلامی تعلیمات سے بیگانہ ہوتے گئے، نو مسلموں سے تو ان کے بہت سے موروثی رسوم و رواج بھی دور نہ ہو سکے، اسی لیے آج بعض اہل قلم کو یہ لکھنے کا موقع مل گیا ہے کہ پنجاب کے بہت سے مسلمان گگتی اور لاچی جیسے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں، امرتسر کے میراثی درگا بھوانی پر نذریں چڑھاتے ہیں، پنڈی کے مسلمان چیچک کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں، یوپی کے مسلمان بھاٹوں کے یہاں برہمن پروہت بنتے ہیں، کچھ کے بعض میمن ہندوؤں کی طرح جسم پر بھبھوت ملتے ہیں، پنجاب کے بعض مسلمان فقرا دھونی بھی رماتے ہیں، یوپی کے جولاہا کالکا مائی کی پوجا کرتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح سہرا دہ کی رسم ادا کرتے ہیں، مشرقی بنگال کے ترک نواس لکشمی دیوی کے سامنے جھکتے ہیں، اور مغربی بنگال کے مسلمان فقیر لکشمی دیوی کے گیت گاتے ہیں، مدراس کے دودکلا

دسہرہ میں ہتھیاروں کی پرستش کرتے ہیں، اگر ایسے مسلمانوں کو ان کے آبائی مذہب میں واپس لانے کی تھوڑی سی بھی کوشش کی جاتی تو وہ آسانی سے ہندو ہو جاتے، اور مسلمان سلاطین جن پر جبر و تشدد سے اسلام پھیلانے کا الزام لگایا جاتا ہے، کبھی ان کو دوبارہ اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرتے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان سلاطین میں وہ مذہبی جوش اور ولولہ نہ تھا جو شروع کے عرب حکمرانوں میں رہا، دوسرے وہ ملک داری اور ملک گیری میں ایسے مشغول رہے کہ ان کو تبلیغ اسلام کی فرصت ہی نہ ملی، یہ ضرور ہے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں انھوں نے شجاعت، پامردی اور سپہگری کے جو جوہر دکھائے اپنے نقطۂ نظر سے اسی کو اسلام کی سربلندی تصور کرتے رہے، اور اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں ان کے کارنامے پر بجا طور سے فخر کیا جا سکتا ہے۔

تسخیر ملک و تسخیر قلوب ہندوستان میں محمود غزنوی کی متواتر لشکرکشی پر خواہ کتنی ہی تلخ بحث کی جائے، لیکن اگر اس کا مطالعہ ایک فوجی سردار کی حیثیت سے کیا جائے تو کسی شخص کو اس کے اعتراف میں تامل نہ ہوگا کہ اس میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ فوجی قائدوں میں پائے جاتے ہیں، وہ میدان جنگ میں اپنی جان پر کھیل کر اس حصہ میں کود پڑتا جہاں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہوتی، مختلف لڑائیوں میں اس کے جسم پر ۷۲ زخم لگے تھے، وہ پورے تہور کے ساتھ لڑتا تو بعض اوقات اس کی گرفت میں تلوار اس طرح چپک جاتی کہ بڑی مشکل سے علحدہ کی جاتی، اس کی جانبازی اور پامردی کو دیکھ کر اس کے لشکری پوری جانبازی اور سرفروشی سے لڑتے، وہ عراق سے لیکر گنگا کی وادی تک تقریباً ۳۲ سال لڑائیاں لڑتا رہا، کبھی ترکستان کی ساری جنگی قوتیں اس کے خلاف معرکہ آرا ہو جاتیں، کبھی ہندوستان کے تمام بہادر راجپوت سردار اس کے خلاف صف آرا ہو جاتے، لیکن وہ کسی موقع پر بھی سراسیمہ نہیں ہوا، ہر لڑائی میں فتح کا سہرا اسی کے سر رہا، اس کا طریقۂ جنگ گوریلا ہی تھا، لیکن اپنی جانبازی سے اپنی فوج میں نئی زندگی اور نئی سرگرمیاں پیدا کرتا رہا، اس کے لشکر میں

عرب، خلجی، افغان، ترکمان، دیلمی اور ہندو بھی تھے، اور ان سب مختلف عناصر کو ملا کر اپنے ایک ناقابل شکست فوجی دستہ بنائے رکھا، وہ تھکنا جانتا ہی نہ تھا، غور کی دشوار گذار پہاڑیاں، کشمیر کی برفستانی وادیاں اور راجپوتانہ کے ہلاکت خیز ریگستانی علاقے اس کی ہمت کو پست نہ کر سکے، وہ غنیم کے سر پر اس طرح دفعۃً پہنچ جاتا کہ اس کو خبر تک نہ ہونے پاتی، اس لیے وہ ان غیر معمولی اوصاف کی بنا پر ان فوجی رہنماؤں کی صف میں جگہ پانے کے لائق ہے جنھوں نے قوموں کی تاریخ بدل دی ہے۔

شہاب الدین غوری کے فوجی کارنامے محمود غزنوی کے سامنے ماند ضرور پڑ جاتے ہیں لیکن اس کو محمود غزنوی پر اس حیثیت سے فوقیت حاصل ہے کہ محمود ہندوستان میں لڑائیاں جیت کر واپس چلا جاتا، لیکن شہاب الدین غوری اس سرزمین میں ایک سلطنت قائم کرنے کے لیے لڑتا رہا، محمود غزنوی کبھی کوئی جنگ نہیں ہارا، اور شہاب الدین غوری کو ہندو راجاؤں نے دو لڑائیوں میں شکست دی، لیکن کسی کو اس کے اعلیٰ درجہ کے فوجی قائد ہونے میں شک نہیں ہوا، وہ میدان جنگ میں اترتا تو پہلے صحیح صورت حال کا جائزہ لیتا، پھر اسی حساب سے اپنی فوج کو صف آرا کرتا، اور اس کی ہدایت کے مطابق اس کے صبا رفتار سوار پہلے آگے بڑھتے، پھر پیچھے ہٹ جاتے، پھر اچانک پلٹ کر غنیم کے بازوؤں کی صفیں الٹ دیتے، وہ کسی حال میں بھی شکست کو شکست تسلیم نہیں کرتا تھا، جب پرتھوی راج سے پہلی بار ہارا تو اس نے قسم کھائی کہ بیوی کی خوابگاہ میں اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک اس شکست کو فتح و کامرانی میں نہ بدل دے گا۔

قطب الدین ایبک نے بعض اپنے سپاہیانہ اوصاف کی بنا پر گمنامی اور غربت سے نکل کر شہرت و ناموری حاصل کی، اور اس کی سپہگری سے متاثر ہو کر شہاب الدین غوری نے اس کو اپنا فرزند بنالیا، شمس الدین التمش جب کسی لڑائی میں شریک ہوتا تو میدان جنگ میں اس سے زیادہ دلیر

اور بہادر کوئی اور فوجی نہ ہوتا، شہاب الدین غوری نے جب گکھروں پر فوج کشی کی تو جہلم کو عبور کرنے میں سب سے پہلے التمش نے برگستوان پہنا اور اپنا گھوڑا مردانہ وار دریا میں ڈال دیا اور اس کو عبور کرکے دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اس کی جانبازی دیکھ کر دوسرے لشکری بھی دریا میں کود پڑے، اس کے اسی سپاہیانہ اور مدبرانہ اوصاف کے سبب سے قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد ایک نوزائیدہ سلطنت ختم ہونے سے بچ گئی، منگولوں کے طوفان کو دنیا کا کوئی ملک روک نہ سکا، لیکن غیاث الدین بلبن نے اپنے آہنی عزم سے ان کی غارت گری سے ہندوستان کو بچالیا، غلام سلاطین کے فوجی سرداروں میں بختیار خلجی نے مٹھی بھر فوج سے بہار اور بنگال کو فتح کیا، بلبن کا چچا زاد بھائی شیر خاں اپنے اوصاف میں واقعی شیر تھا، وہ جب تک زندہ رہا، تاتاری، سنام، لاہور اور دیپال پور کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ کرسکے، ملک قمر الدین قیران تمر اور ملک عز الدین طغرل طغان نے اودھ اور لکھنوتی کو دہلی سے منسلک کیا،

خلجی سلاطین میں جلال الدین خلجی کہا کرتا تھا کہ اگر میں اپنی تلوار کھینچ لوں تو بیس بائیس افراد کو تہاہو ڈالوں، اور اگر سر میدان کھڑا ہو جاؤں تو اگر ایک بڑی جماعت مجھ پر چوالیس بار بھی حملہ کرے تو میرا بال بیکا نہیں کرسکتی، علاء الدین خلجی صحیح معنوں میں تمام فوجی سرداروں کا سردار تھا، وہ دشمنوں کو مغالطے میں ڈال کر اور تھکا کر پسپا کر دیتا تھا، اس کے سرداروں میں ظفر خاں میدان جنگ میں اپنے حریفوں سے کشتی لڑکر اپنی بہادری کا جوہر دکھاتا تھا، الغ خاں اور نصرت خاں نے ملتان، گجرات، رنتھنبور اور جیسلمیر وغیرہ کو فتح کرکے خلجی حکومت کا دبدبہ قائم کیا، ملک کافور ہزار دیناری کے سر دکنی فتوحات کا سہرا رہا،

غیاث الدین تغلق نے منگولوں سے ۲۹ بار جنگ کی اور ہر بار ان کو شکست دی، سلطان محمد تغلق کے نصف دور حکومت تک اس کی فوج جہاں بھی گئی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتی آئی، سکندر لودی اپنی فوج

اس قدر حاوی تھا کہ وہ جب کہیں کوئی لشکر بھیجتا تو صبح و شام دو فرامین بھیجا کرتا تھا، جس میں روزانہ کی ضروری ہدایتیں ہوتی تھیں اور کسی کو اس کی عدول حکمی کی جرأت نہ ہوتی تھی،

ایک فوجی قائد میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں، وہ سب بابر میں موجود تھیں، اس نے جتنی لڑائیوں میں فتح حاصل کی، اتنے ہی میں شکست بھی کھائی، لیکن شکست سے اس کی اندرونی صلاحیتیں اور بھی ابھر آتیں، وہ اپنے لشکریوں اور ساتھیوں کو محض اپنی باتوں اور تقریروں سے تازہ بنا دیتا تھا،

اکبر کا شمار دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں ہوتا ہے، اس کی تیز گامی، شمشیر زنی، نیزہ بازی اور نشانہ بازی، دشمنوں پر بجلی کی سرعت کے ساتھ یورش، حیرت انگیز حد تک تھی، اس نے اپنی فوج کا جو نظم و نسق قائم کیا تھا وہ اس دور کے لحاظ سے بہترین سمجھا جاتا تھا، اسی لیے اس کو کسی جنگ میں شکست نہیں ہوئی، جہانگیر گو بڑے ناز و نعمت میں پلا تھا، لیکن ضرورت کے وقت ایک جری سپاہی بھی بن جاتا تھا، وہ نور جہاں سے کئی دن تک محض اس لیے خفا رہا اور نہیں بولا کہ ایک بار اس کے ایک خیمہ میں ایک شیر آگیا تو وہ بھاگ کر دوسرے خیمہ میں چلی گئی تھی، شاہ جہاں کو اپنے جنگی تجربات پر اتنا بھروسہ تھا کہ جب اس نے بلخ اور قندھار کی تسخیر کے لیے اپنے شہزادوں کو بھیجا تو دار السلطنت میں بیٹھ کر ان کو ہدایتیں بھیجتا تھا، عالمگیر کی فوجی قیادت کے مقابلہ میں بڑے بڑے آزمودہ کار فوجی سردار بے بس ہوکر رہ جاتے اور بلخ کے حکمرانوں کو کہنا پڑا کہ ایسے آدمی سے لڑنا اپنی قسمت سے جنگ کرنا ہے، اسی کے زمانہ میں مغلوں کی سلطنت کے حدود انتہائی درجہ تک پہنچ گئے،

مغل بادشاہوں کے فوجی سرداروں کے کارنامے بھی فخر کے ساتھ لکھے جانے کے لائق ہیں، اکبری عہد میں بیرم خاں، خان خاناں، شہاب الدین بہادر خاں، اتگہ خاں، منعم خاں، مظفر خاں، خان اعظم مرزا کوکہ خاں، لشکر خاں، شہباز خاں، ادہم خاں کوکہ، آصف خاں، فتح اللہ شیرازی، مرزا قوام الدین جعفر ملک، اور جہانگیری عہد میں امیر الامراء شریف خاں، شیخ فرید، خانخاناں عبد الرحیم خاں،

آصف خاں قزوینی، آصف خاں ابوالحسن، صادق خاں، ارادت خاں، اسلام خاں خشتی، اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی، احمد خاں نیازی، اللہ وردی، شاہجہانی دور میں علامہ شکر اللہ افضل خاں، آصف خاں ابوالحسن، ارادت خاں، صادق خاں، اسلام خاں، میر جملہ، معتمد خاں، صلابت خاں، احسن اللہ خاں، جعفر خاں، اور خلیل اللہ خاں، عالمگیری عہد میں میر جملہ، محمد امین خاں، افضل خاں، شائستہ خاں، دلیر خاں، ہمت خاں، ذوالفقار خاں، قاسم خاں وغیرہ نے جو فتوحات حاصل کیے وہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ کے لیے شاندار اور زریں کارنامے کہے جاسکتے ہیں،

ظاہر ہے کہ ان فاتحوں کو بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں جن میں بیشمار جانیں تلف ہوئیں، خونریزی کے ساتھ غارتگری بھی ہوئی، جیسا کہ جنگ کے موقع پر آج بھی متمدن ممالک میں ہوتی ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ خونریزی اور غارتگری اسلام کی طرف منسوب کردی گئی اور ان فاتحوں کی تلوار اسلام کی تلوار سمجھی گئی، اس میں شک نہیں کہ جنگ کے وقت جہاں اور تدبیریں کی جاتی تھیں، وہاں لشکریوں کی مذہبی غیرت اور حمیت بھی ابھاری جاتی، جس سے بڑا فائدہ حاصل ہوتا تھا، اس لیے فاتحین عام لڑائیوں کو بھی جہاد کا رنگ دیدیتے تھے لیکن ان لڑائیوں کو جہاد کا رنگ دینے میں اسلامی تعلیمات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے تھا، جس میں اس کی تصریح ہے کہ جنگ کے موقع پر ایسے لوگوں کو چھوڑ دیا جائے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہو، عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کیے جائیں، پھل دار درخت نہ کاٹے جائیں، کوئی آباد جگہ ویران نہ کی جائے، بکری اور اونٹ کھانے کے سوا بیکار نہ ذبح کیے جائیں، نخلستان نہ جلائے جائیں، مال غنیمت میں غبن نہ کیا جائے، لوٹ کا مال مردار کا گوشت سمجھا جائے، خانقاہیں اور عبادت گاہیں منہدم نہ کیجائیں، اور نہ کوئی ایسا قصر گرایا جائے جس میں ضرورت کے وقت دشمن قلعہ بند ہوتے ہوں، ناقوس پھونکنے اور گھنٹے بجانے کی ممانعت کسی حال میں نہ ہو،

اگر یہ تمام باتیں ملحوظ رکھی جاتیں تو واقعی مسلمان فاتحین کی لڑائیوں سے اسلام کو سربلندی

حاصل ہوتی، لیکن اس کے بجائے مسلمان فاتحین اپنی نسلی اور قبائلی خصوصیات کی بنیاد پر وہ تمام باتیں کرتے رہے جو عام طور سے جنگ کے موقع پر ہوتی ہیں، گو ملک گیری کے بعد ملک داری کے سلسلہ میں انھوں نے مفتوحہ علاقہ میں امن پروری اور عدل پسندی کی بہتر سے بہتر مثالیں پیش کیں، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے،

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ان کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان کی تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بہت سے جلوے پیدا ہوئے، درباری اور معاشرتی زندگی میں نئے نئے آداب رائج ہوئے، جن کو خود یہاں کے ہندو راجاؤں نے بھی اختیار کیا، زینت و آرائش میں انتہائی حسن وجمال نظر آنے لگا، علوم وفنون کی سرپرستی میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا، لباس میں بڑا تنوع پیدا ہوا، کپڑے کی مصنوعات کو انتہائی ترقی ہوئی، زربفت، مخمل، طاس، مشجر، دیبا، ململ، پشمینے، شال، قالین وغیرہ کی طرح طرح قسمیں بنائی گئیں، مختلف قسم کے زیورات کی صناعی میں بڑی لطافت پیدا کی گئی، جواہرات کا انبار لگا دیا گیا، سنگار کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے، خوشبوئیات میں مشک، عنبر، لادن، کافور، زباد، مید، عود، صندل، سلارس، لوبان، اظفار الطیب، منتوک، ارگجہ، عبیر مایہ، زعفران وغیرہ سے طرح طرح کی چیزیں تیار کی گئیں، پھولوں کی چمن آرائی خیابان بندی اور طرح ادائی کو ایک مستقل فن بنا دیا گیا، لاہور، دہلی، کشمیر اور آگرہ کے باغات آج بھی ان کے ذوق کی لطافت کی گواہی دے رہے ہیں، پھلوں میں پیوند کاری کرکے بہت نئے پھل ہندوستان میں رائج کیے گئے، کھانے کی چیزوں میں چاول، آٹے اور گوشت کی جتنی متنوع چیزیں بنائی گئیں، پھر طرح طرح کے جو حلوے اور مربے تیار ہوئے، ان سے ہندوستانی کھانوں میں بڑی رنگارنگی پیدا ہوئی، فن تعمیرات میں شلغم نما گنبدوں، کئی کئی پہل کے برجوں، پھر نقاشی، میناکاری، استرکاری، کاشی کاری، سنگ مرمر پر پچی کاری وغیرہ پر جو جدت پیدا کی گئی، اس کو کسی حال میں

بھلایا نہیں جا سکتا، تاج محل آج بھی اس زمانے کے فن تعمیرات کی لطافت، نفاست اور نزاکت کی شہادت دے رہا ہے،
موسیقی میں امیر خسرو، حسین شاہ شرقی، نائک بخشو، تان سین، باز بہادر، سبحان خاں، محب خاں، بایزید خاں،
سلطان زین العابدین، سلطان مظفر گجراتی، سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی، سلطان واجد علی شاہ کی ایجادات
کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اکبر اور جہانگیر کے عہد میں فن مصوری میں جو نزاکت، رنگ آمیزی، باریکی، مرصع کاری
اور فطرت نگاری پیدا ہوئی، اس سے ایک خاص اسٹائل بنا، جو مغل مصوری کے نام سے اب تک باقی ہے۔
اور یہ اسٹائل نہ بنا ہوتا تو ہندوستان کی مصوری کے مختلف اسکول وجود میں نہ آتے، کاغذ
مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے۔ رنگ پور، اچہ، جونپور، احمد آباد، احمد نگر، نعمت آباد،
برہانپور، زین آباد، مبارک آباد، مصطفےٰ آباد، دولت آباد، فیروز آباد، لاہور، الہ آباد،
آگرہ، فتحپور سیکری، حیدر آباد، مراد آباد، اورنگ آباد، ابراہیم آباد، عظیم آباد، بھکر،
سامانہ، اور خدا جانے کتنے اور قصبات اور قریے مسلمانوں کے زمانے میں آباد ہوئے، پھر
جو پل، نہریں اور سڑکیں تعمیر کی گئیں ان کی ان گنت تعداد شمار میں نہیں آسکتیں پھر پورے ہندوستان
کی پیمایش کرائی گئی، قابل زراعت اور ناقابل زراعت زمینوں کی تفریق کی گئی، تقاوی دینے کا قاعدہ
جاری کیا گیا، تشخیص وجمع کے متعدد طریقے مقرر ہوئے، زمین کی قسمیں کی گئیں، مثلاً بٹائی، بارانی،
چاہی، نہری وغیرہ، حیوانات کی نسل کی ترقی میں پوری کوشش کی گئی، ان تمام تفصیلات کے لیے
علیحدہ کتابیں بھی مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔ اور خود جدو ناتھ سرکار نے ہندوستان پر مسلمانوں کے
احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ (۱) مسلمانوں نے ہندوستان کے تعلقات
بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہاز رانی اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا،
ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ دونوں چیزیں ختم ہو گئی تھیں، (۲) ہندوستان
کے بیشتر علاقوں خصوصاً وندھیا کے شمال میں اندرونی طور پر امن وسکون قائم ہوا

(۳) ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک میں یکسانیت پیدا ہوئی (۴) مذہبی عقائد کے
اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگوں کے عادات واطوار ولباس وغیرہ اور معاشرتی امور
میں یکرنگی پیدا ہوئی (۵) ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا جس میں ہندوؤں اور
چینیوں کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، اس سے تعمیرات میں ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ
قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگاریں
ہیں (۶) ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی، جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی،
نثر نویسی میں ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا جس کی بنا ان ہندو منشیوں نے ڈالی
جو فارسی لکھا کرتے تھے، اور اس اسٹائل کو مرہٹوں نے بھی اپنی زبان میں رائج کیا (۷) دہلی
کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی،
(۸) مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی اور تصوف پھیلا (۹) تاریخی لٹریچر پیدا ہوا
(۱۰) فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا، جدو ناتھ سرکار یہ بھی لکھتے ہیں کہ
مسلمانوں ہی کی وجہ سے تعمیرات میں ایک نیا طرز ایجاد ہوا، محلوں اور مقبروں کی تعمیر انکی
خاص چیز ہے۔ پھر ان کی وجہ سے مصوری کا ایک خاص اسکول قائم ہوا، اور ان ہی کی وجہ سے
ہندوستان میں فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا،

لیکن یہ دیکھکر دکھ ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کا ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو ان تمام
کارناموں کو نظر انداز کر کے مسلمان بادشاہوں نے جنگ کے زمانے میں جو کچھ کیا اسی کو زیادہ
اچھالنے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس سلسلہ کی خونریزی اور غارت گری کو اسلام کی
طرف منسوب کر کے اسلام کے خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کر رہا ہے۔

تسخیر قلوب | مسلمانوں نے جنگ کے خلاف جنگ کی انھوں نے غصہ اور عداوت میں اگر مسلمانوں کے مذہب کو بھی بدنام کر لے

کی کوشش کی، یہ علماء کا فرض تھا کہ جنگ کے بعد اسلام کی سچی تعلیم کے مطابق اس کو دین رحمت کی حیثیت سے پیش کرتے، اور یہ بتلاتے کہ ان کی کوئی تعلیم بھی انسانوں کے لیے رحمت سے خالی نہیں، اور دنیا کی کوئی مخلوق بھی اس کے فیضان رحمت سے محروم نہیں، اس کا خدا رحمن و رحیم ہے، ستار و غفار ہے، اس کی تمام صفات میں رحمت، ستاری اور غفاری کا غلبہ ہے، اس کی رحمت و مغفرت کا دروازہ گنہ گاروں کے لیے بھی بند نہیں، اور بڑے سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت بے پایاں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اسلام میں انسان کا رتبہ بہت بلند ہے، وہ اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے، زمین و آسمان، چاند اور سورج، دریا اور سمندر، خشکی اور تری سب اس کے لیے پیدا کی گئی ہے، اسلام رنگ و نسل و نسب اور سارے امتیازات کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے، اور وہ سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کرنا چاہتا ہے، وہ انسانی مساوات، اخوت، غرباء و مساکین کی پرورش، خدمت خلق، انسان دوستی، عدل پروری، رحم و کرم، لطف و مدارات، نیک کاموں کی تبلیغ و ترغیب اور برائیوں کے انسداد کے لیے ہے، وہ اس حدیث قدسی کی عملی تعبیر و تشریح ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عز و جل قیامت کے دن فرمائے گا کہ اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا پروردگار! میں تیری عیادت کس طرح کرتا، تو تو خود سارے جہان کا پروردگار ہے، خدا فرمائے گا، کیا تجھکو نہیں معلوم میرا فلاں بندہ بیمار پڑا، مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو عیادت کرتا تو مجھکو اس کے پاس موجود پاتا، اے ابن آدم! میں نے تجھسے کھانا مانگا تو نے نہیں کھلایا! بندہ عرض کرے گا، پروردگار، تو تو خود رب العالمین ہے، میں تجھکو کھانا کس طرح کھلاتا، خدا فرمائے گا، میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا،

مگر تو نے نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا، پروردگار، میں تجھکو کس طرح پانی پلاتا، تو تو خود رب العالمین ہے، خدا فرمائے گا، فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تو نے نہیں پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس موجود پاتا۔

اسی طرح علماء اس کا ثبوت دیتے کہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی انسان سے نفرت نہ کیجائے، اور ان کو انسانی حقوق سے محروم نہ کیا جائے، اور ان سے معاشرتی حقوق ادا کیے جائیں، کیونکہ کلام مجید میں دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت ہے، اور یہ حکم ہے کہ مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے لوگوں (معبودوں) کو پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ بھی ناحق اور نادانی سے خدا کو برا کہیں، پھر کلام مجید میں یہ بھی ہے کہ دین میں جبر و زبردستی نہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کے مظالم سے تنگ آجاتے، اور آپ سے درخواست کی جاتی کہ آپ ان کے لیے بددعا فرمائیں تو آپ فرماتے کہ میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں، بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں،

پاک طینت علماء نے اسلام کو اس رنگ میں ضرور پیش کیا ہوگا، کیونکہ اگر اسلام اس رنگ میں یہاں کے باشندوں کو نظر نہ آتا تو یہاں وہ سرسبز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن ایسے علماء کی کوششوں کا ذکر تاریخوں میں نہیں کیا گیا ہے، اور ستم یہ ہے کہ بعض مورخوں نے بعض متشدد علماء کے ایسے اقوال نقل کر دیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، مثلاً ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی نے قاضی مغیث الدین سے ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ

"ہندوؤں کو ذلیل رکھنا دینداری کے لوازم میں سے ہے، کیونکہ یہ حضرت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اسی لیے حضرت مصطفیٰ علیہ السلام نے ہندوؤں کے قتل اور ان سے مال غنیمت لینے اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا ہے۔" (ص ۲۹۰)

یہ تمام تر قاضی مغیث الدین کی من گھڑت حدیث ہے، جس کو مولانا ضیاء الدین برنی نے خواہ مخواہ نقل کر کے نہ صرف اس عہد کی تاریخ بلکہ اسلام کو نقصان پہنچایا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کے رویے کی جو وضاحت کر دی ہے وہ اس حدیث کی روایت سے ظاہر ہوتی ہے، جو قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں کی ہے، اس میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقم کو جزیہ کے وصول کرنے پر مقرر کیا تو ان کو بلا کر فرمایا

الا من ظلم معاهدا او کلفه	جان لو کہ جو شخص کسی معاہد (یعنی ذمی) پر
فوق طاقته او انتقصه واخذ	ظلم کرے گا یا اس سے اس کی طاقت سے
منه شیئا بغیر طیب نفسه فانا	زیادہ کام لے گا یا اس کو ذلیل کرے گا
حجیجه یوم القیامة	یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر
	لے گا تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہونگا

صحابہ کرام کا بھی عمل اسی پر رہا، شام کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا، اس میں یہ الفاظ تھے، کہ مسلمانوں کو ان کے ظلم و نقصان سے روکو اور ان کے مال کھانے سے منع کرو، اور ان کو جو حقوق تم نے جن شرائط پر دیے ہیں، ان کو پورا کرو، حضرت عمرؓ کو ایک غیر مسلم ہی نے شہید کیا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی وفات کے وقت نہایت ضروری وصیتیں جو کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ذمیوں یعنی غیر مسلموں کے ساتھ جو اقرار ہیں

وہ پورے کیے جائیں، ان کی طاقت سے زیادہ کام ان سے نہ لیا جائے اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی طرف سے لڑائی کی جائے، حضرت عمرؓ کی اس وصیت کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، حضرت عمرؓ کے پاس ایک عیسائی غلام استنق نامی تھا، جس کو انھوں نے دعوت اسلام دی، اس نے انکار کیا تو فرمایا لا اکراہ فی الدین یعنی مذہب میں کوئی زبردستی نہیں، اور دوسرے صحابہ بھی ذمیوں یعنی غیر مسلموں پر کسی قسم کی سختی ہوتی دیکھتے تو فوراً مواخذہ کرتے تھے، سعید بن زیدؓ نے ایک دفعہ دیکھا کہ ذمیوں کو مال گذاری وصول کرنے کے لیے دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے، اسی وقت وہاں کے حاکم سے جا کر کہا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص لوگوں کو عذاب دیتا ہے، خدا اس کو عذاب دے گا، ہشام بن حکیم کو بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا اور انھوں نے اسی وقت حاکم یعنی عیاض بن غنم کے پاس جا کر ملامت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی قول سند میں پیش کیا، ان تاریخی حقائق کے باوجود مولانا ضیاء الدین برنی کو قاضی مغیث الدین کے اس بیان کو نقل کرنے میں تامل نہیں ہوا کہ محصل دیوان جب ہندو خراج گذار کے منہ میں تھوکے تو وہ بغیر کسی کراہت کے اپنا منہ کھول دے اور اس حالت میں بھی محصل کی پوری خدمت کرے، مولانا ضیاء الدین برنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں ایک مشہور مصری محدث اور عالم مولانا شمس الدین ترک ہندوستان تشریف لائے تو علاء الدین خلجی کا طرز عمل یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ جو خواری، زاری، لا اعتباری اور بے مقداری کا تھا، اس پر آفرین بھیجی، لیکن موجودہ دور کا کوئی تنگ نظر اور متعصب عالم بھی اس مصری عالم کے آفرین بھیجنے پر خوش نہیں ہو سکتا، معلوم نہیں اس زمانے میں کس پس منظر میں ایسی فضول باتیں کہی گئیں، جن کو اسلام سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے، اس سے کوئی

فائدہ تو حاصل نہیں ہوا، لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ اس قسم کے اقوال سے شرارت پسندوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک حربہ مل گیا۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی دور میں مولانا ضیاء الدین برنی کے معاصر اور دوست امیر خسرو اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعہ سے ہندوؤں کی تسخیر قلوب کے لیے ہر قسم کی کوشش کررہے تھے، اور ان کی شاید یہ تمنا تھی کہ یہاں کے مختلف باشندوں میں یگانگت اور موانست ہو، اور وہ ایک دوسرے کے خدمات کو سمجھ کر باہمی احترام کا جذبہ پیدا کریں، چنانچہ وہ اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں ایک آتش پرست ہندو کا ذکر قصہ اُلٹے آتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ اس سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے، اور اس کے لیے کیوں جان دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں رہتی ہے، اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے، خسرو نے اس جذبہ کی قدر کی ہے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے علوم و فنون کی مدح سرائی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دانش و معانی ہندوستان میں اندازہ سے باہر ہے، یونان حکمت میں مشہور ہے، لیکن ہندوستان اس میں تہی مایہ نہیں، یہاں منطق بھی ہے اور نجوم اور کلام بھی، البتہ ہندو فقہ سے واقف نہیں ہیں، لیکن وہ طبعیات، ریاضیات اور ہیئت کے ماہر ہیں، مابعد الطبیعیاتی علوم نہیں جانتے ہیں، لیکن مسلمان اور دوسری قومیں بھی ان سے ناواقف ہیں، خسرو ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی معترف تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں، لیکن ان کے بہت سے عقائد ہمارے عقائد سے مشابہ ہیں، وہ خداوند تعالیٰ کی توحید، اس کے وجود اور قدم کے معترف ہیں، اس کی قدرت ایجاد اور اس کے رازق، خالق، فعال، فاعل مختار اور عالم جزو کل ہونے کے قائل ہیں، اس سلسلہ میں امیر خسرو نے ہندوؤں کے مذہب کا بھی اسلام کے علاوہ اور تمام مذہبوں سے مقابلہ کیا ہے"

اور اس کو ان سے بہتر بتایا ہے، اور اس کے وجوہ یہ بیان کیے ہیں کہ ثنوی فرقہ خدا کو دو مانتا ہے، لیکن ہندو ایک مانتے ہیں، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس قسم کے عقائد کے قائل نہیں، فرقۂ مجسمہ خدا کو صاحبِ جسم مانتا ہے، لیکن ہندو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے، ستارہ پرست سات خدا کو مانتے ہیں، لیکن ہندو اس قسم کے عقائد کے قائل نہیں، فرقۂ مشبہ خدا کو ممکنات سے تشبیہ دیتے ہیں، ہندو اس کے خلاف ہیں، پارسی نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس خیال سے بری ہیں، وہ پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں، لیکن ان کی پرستش میں اخلاص ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں اور اس کی اطاعت کے منکر نہیں، وہ اور چیزوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آباد اجداد ان کی پوجا کرتے آئے ہیں،

امیر خسرو ہندو مرد اور عورت کے جذبات وفاشعاری سے بھی متاثر ہوئے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے، اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لیے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اور وہ تو یہ بھی کہہ گئے ہیں،

اے کہ ز بت طعنہ بہ ہندو بری ہم از وے آموز پرستش گری

اور پھر تسخیر قلوب کے لیے امیر خسرو نے ہندوستان کی ہر چیز کی تعریف کی ہے، اپنے ہم مذہبوں کو اس سے محبت اور لگاؤ پیدا کرنے کی تلقین کی، ہندوستانی زبان، ہندوستانی کپڑوں، ہندوستانی پھولوں، میووں، پرندوں، جانوروں اور عورتوں کے حسن کے بیان کرنے میں ان کا قلم رقص کرنے لگتا ہے، اسی تسخیر قلوب کے لیے انھوں نے ہندی میں اشعار کہہ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ چھائے رہیں گے

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی ڈسکوری آف انڈیا میں تحریر فرماتے ہیں کہ امیر خسرو نے بہت سے موضوع پر لکھا ہے، خاص طور سے ہندوستان کی ان چیزوں کی مدح کی ہے جن میں ہندوستان کو فوقیت حاصل ہے، یہاں کے مذہب، فلسفہ، منطق، زبان، سنسکرت، گرامر، موسیقی، ریاضی، سائنس اور آم کی تعریف کی ہے، لیکن ان کی زیادہ شہرت ان کے مشہور گیتوں کی وجہ سے ہوئی جو انھوں نے عام فہم ہندی زبان میں لکھے ہیں،" پنڈت جی یہ بھی لکھتے ہیں کہ مجھکو کسی جگہ کی ایسی مثال نہیں ملی کہ چھ سو برس پہلے جو گیت لکھے گئے وہ عوام میں برابر مقبول رہے، اور الفاظ کی تبدیلی کے بغیر ویسے ہی گائے جاتے ہیں،

امیر خسرو کی تقلید میں بہت سے مسلمان شعرا نے ہندی اور سنسکرت میں اشعار کہے، ان کے ناموں کی فہرست طویل ہے، کچھ کے نام یہ ہیں، داؤد، قطبن، ملک محمد جائسی، شیخ نبی، قاسم شاہ، نور محمد، تاج، جمال، عبدالرحیم خانخاناں، قادر، مبارک، عالم، شیخ، شاہ محمد نظام الدین مدھنایک، سید رحمت اللہ، میر عبدالجلیل بلگرامی، غلام نبی، سید برکت اللہ، محمد عارف، شاہ کاظم وغیرہ،

خود صوفیہ کرام نے ہندی دوہے کہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ حضرت شیخ شرف الدین یحیی منیری، حضرت شیخ عبدالحق ردولوی، اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے دوہے مشہور ہیں، قوالی میں بھجن کا رنگ غالباً ہندوؤں ہی کی تسخیر قلوب کے لیے پیدا کیا گیا، صوفیہ کرام نے اپنی للہیت، محبت، شفقت، نرمی، خوش خلقی، وسیع المشربی، وسیع الخیالی اور انسان دوستی سے غیر مسلموں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش برابر کی، حضرت شیخ نظام الدین اولیا، ہندو جوگیوں سے بلا تکلف ملتے اور ان کی باتیں غور سے سنتے، فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار اجودھن میں حضرت فرید الدین گنج شکر کے پاس ایک جوگی آیا تو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے

اس سے پوچھا کہ تم کونسی روش پسند کرتے ہو اور کس چیز پر عمل کرتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے علوم یہ بتاتے ہیں کہ انسانی نفس میں دو عالم ہیں، ایک عالم علوی اور ایک عالم سفلی سر سے ناف تک تو عالم علوی ہے، اور ناف سے پاؤں تک عالم سفلی ہے، عالم علوی میں سچائی، صفائی، بلند اخلاق اور حسن معاملہ ہوتا ہے، اور عالم سفلی میں نگہداشت، پاکی اور پارسائی ہوتی ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیا نے جب یہ باتیں سنیں تو فرمایا

مرا ایں سخن او خوش آمد

اسی طرح ایک اور جوگی حضرت فرید الدین گنج شکر کی خانقاہ آیا تو اس نے بچوں کی پیدائش کے متعلق گفتگو کی جس کو حضرت شیخ نظام الدین اولیا نے بڑے شوق سے سنا اور کہا کہ میں نے تمھاری گفتگو کو سنکر ذہن نشین کر لیا ہے، اور تم بھی میری گفتگو کو غور سے سنو۔

غیر مسلموں کے ساتھ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کا جو رویہ رہا، اس کی ترجمانی شاہ محمد سلیمان تونسوی (المتوفی ۱۲۶۹ھ) کے ان ملفوظات سے ظاہر ہے جو نافع السالکین میں درج ہے، انھوں نے فرمایا کہ ہمارے سلسلہ کے طریقہ میں ہے کہ ہندو اور مسلمان سے صلح رکھی جائے اور اس بیت کو شہادت کے طور پر پیش کرتے تھے،

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

با مسلماں اللہ اللہ اور با برہمن رام رام سے مراد یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں جام شریعت ہو تو دوسرے ہاتھ میں سندان عشق، اور تمام اکابر صوفیہ کا عمل اسی پر رہا، اور اسی کے ذریعہ ہندو مسلم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکتے تھے، البتہ کچھ صوفیہ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے تسخیر قلوب کی خاطر جام شریعت تو چھوڑ دیا اور صرف سندان عشق لیکر آگے بڑھے،

کشمیر میں کچھ ایسے صوفی پیدا ہو گئے تھے جو اپنے کو ریشی کہتے، انھوں نے ہندو رشیوں ہی کی طرح یوگ، حبس دم اور دھیان، گیان کے طریقوں کو اپنایا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں کچھ ایسے صوفی بھی تھے، جو تصوف اور ویدانت کو ایک ہی چیز سمجھتے رہے، پھر کبیر، اکبر اور دارا شکوہ صرف سندان عشق ہی کے معترف تھے، کبیر نے جب یہ تعلیم دی کہ دنیا کا مالک ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے سامنے دیوی دیوتاؤں کی کوئی حقیقت نہیں، وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے محض سچے پریم کی ضرورت ہے، کسی کی وساطت اور شفاعت درکار نہیں،

کہے کبیر اک، رام جپو لے، ہندو ترک نہ کوئی

تو اس میں بڑی ہمہ گیریت تھی، لیکن اس پیام میں سندان عشق کے ساتھ جام شریعت نہیں تھا، اسی لیے علماء کے زیر اثر رہنے والے مسلمان عوام ان کی طرف بہت زیادہ مائل نہیں ہوئے، یہی حال دین الٰہی کا بھی ہوا،

اکبر کے دین الٰہی میں بظاہر بڑی وسیع المشربی ہے، اور اس کو ایک گروہ انسانیت کا بہت بڑا منشور سمجھتا ہے، اکبر نے اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے غیر مسلموں ..... کے دلوں کو تسخیر کر کے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن جب اس نے اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی تو پہلے اس کو امام عادل، مجتہد، صاحب دین حق اور ہندوستان بہتر فرقوں کے اختلاف مٹانے والا نبی امی بننا پڑا، اور پھر دین الٰہی کی تاسیس و ترویج کے سلسلہ میں اس نے جو کچھ کیا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی اس مذہبی بدعت سے نہ صرف اس زمانہ کے مسلمان برگشتہ خاطر ہوئے، بلکہ خود شہزادہ سلیم میں آزردگی پیدا ہوئی

مآثر الامرا جلد دوم ص ۱۷۶ میں ہے،

"جنت مکانی (یعنی جہانگیر) می نویسد کہ چوں شیخ ابوالفضل بہ پدر من ذہن نشین کردہ بود کہ جناب ختمی پناہی (صلی اللہ علیہ وسلم) فصاحت تمام داشت، قرآن کلام اوست لہذا وقت آمدنش از دکن نرسنگھ دیو گفتم کہ بقتل آرد، بعد ازیں پدرم ازیں اعتقاد برگشت"۔

اس دور کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا حضرت احمد سرہندیؒ کو بھی دکھ تھا کہ اکبر نے کلمہ کی جگہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ پڑھوانا شروع کیا تھا، حج، زکوٰۃ، نماز باجماعت کو بدعقلی کی باتیں قرار دی گئی تھیں، مسلمانوں کے لیے گاؤکشی کی ممانعت ہو گئی تھی، لیکن سور اور کتے کے ناپاک ہونے کا مسئلہ منسوخ کر دیا گیا تھا، مسلمانوں کے لیے قاضیوں کا مقرر کرنا بند ہو گیا تھا، حتیٰ کہ مسجدیں ویران ہو گئی تھیں، بلکہ بہت سی منہدم کر دی گئی تھیں وغیرہ وغیرہ، ان تمام باتوں سے حضرت احمد سرہندیؒ کو انتہائی تکلیف تھی، وہ بڑے دکھ اور درد سے جہانگیر کے دربار کے ممتاز امیر شیخ فرید کو لکھتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں اہل اسلام کے سر پر کیا گذرا ہے ..... مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز تھے، اور اگر کرتے تھے تو قتل کیے جاتے تھے، (مکتوب نمبر ۴۶ جلد اول)

اسی سلسلہ میں بعض اوقات انھوں نے ہندوؤں اور شیعوں کے متعلق کچھ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو، لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انتہائی آزردگی اور اشتعال کا نتیجہ ہے، وہ ایک دکھے ہوئے دل کی چیخ اور پکار ہے، اکبر کی بدعتوں سے جو نتائج پیدا ہوئے، وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھے، ان کے لیے تو بدعت حسنہ بھی کوئی چیز نہیں تھی، اور اکبر کی تمام بدعتیں تو ان کے نزدیک تو بدعات سیئہ تھیں، وہ اسلامی عقائد میں کسی قسم کی بیرونی آمیزش پسند نہ کرتے تھے،

دوسرے مذاہب سے اسلام کا موازنہ اور مقابلہ کرکے خواہ مخواہ کا اشتراک پیدا کرنا بھی ان کو گوارا نہ تھا، ایسی کوششوں سے ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی تھی، اسی لیے انھوں نے اسلام کو تمام بدعتوں سے پاک کرنے میں بڑی صعوبتیں اٹھائیں، اور جو ہندوانہ رسم و رواج مسلمانوں میں پیدا ہوگئے تھے، ان کو بدعت سیئہ سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی تو مذمت کی ہے کہ مسلمانوں نے ان کو قبول کرلیا ہے، لیکن جہانگیر کے زمانے میں جب ان کی مقبولیت زیادہ بڑھی تو اس وقت بھی کبھی سرزمین ہند سے ہندوؤں کی معاشرت سے ان کے رسم و رواج کو بالکل ہی پاک کردینے کی تلقین نہیں کی، کسی مسلمان کا ہندو ہونا تو ان کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتا، لیکن ہندو کا ہندو رہنا ان کو کسی حال میں ناگوار نہ ہوتا، وہ اپنے مکتوب میں لکم دینکم ولی دین کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور غیر مسلم اپنے طریق (کیش) پر رہیں (مکتوب ۲۴۶ ج اول) اور وہ تو اس کے بھی قائل تھے کہ ہندوستان میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے، اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ گذشتہ امتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی جگہ بہت کم ہے جہاں پیغمبر مبعوث نہ ہوئے ہوں، اہل ہند میں بھی پیغمبر ہوئے، اور صانع جل شانہ کی طرف دعوت دی گئی، ہندوستان کے بعض شہروں میں محسوس ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انوار اندھیروں میں شعلوں کی طرح روشن ہیں، اگر کوئی ان شہروں کو متعین کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور ہندوستان میں جن لوگوں نے واجب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات اور اس کے تنزیہ و تقدیس کی نسبت لکھا ہے، سب انوار نبوت سے مقتبس ہیں، کیونکہ گذشتہ امتوں میں ہر ایک کے زمانہ میں ایک نہ ایک پیغمبر ضرور گذرا ہے، جس نے واجب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات قدیمہ اور اس کے تنزیہ و تقدیس کی نسبت خبر کی ہے (مکتوب ۲۵۹ ج ۱)

اگر حضرت احمد سرہندیؒ کے بعض مکتوبات میں لینت اور نرمی کے بجائے ان کے مسلک کی شدت اور سختی کا اظہار ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری اکبر پر آتی ہے جس نے دلوں کی تسخیر دلوں کو دکھا کر کیا، اور یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس کے دین الٰہی اور دوسرے اقدام سے ہندو تو اس کی طرف ضرور مائل ہوگئے، لیکن ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب تر نہ ہوسکے، بلکہ ہندو مسلمان کا ایک ملاجلا معاشرہ خود بخود بن رہا تھا، اس کو سخت نقصان پہنچا،

بابر نے پانی پت اور کنواہا میں بڑی خونریزی کرکے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی پھر بھی اس نے یہاں کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرنے کی پوری کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہا، پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کے ..... بارے میں لکھا ہے کہ اس کی ذات میں بڑی دلکشی تھی، وہ نشاۃ ثانیہ کے عہد کا ایک رہنما تھا، بہت ہی بہادر اور دلیر تھا، آرٹ، ادب اور خوش باشی کا دلدادہ تھا، ہمایوں نے بھی اپنی رواداری سے یہاں کے باشندوں کو اپنی طرف مائل رکھا، اور شیر شاہ کی رواداری کا راگ تو ہر زمانہ میں الاپا جائے گا، اس نے مذہب اور سیاست میں ایسا خوشگوار امتزاج پیدا کردیا تھا، جس سے ہندوستانی قومیت کو ترقی کرنے کیلئے نہایت مناسب فضا مل گئی تھی، انگریز اور ہندو دونوں مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ہندوستان کا پہلا حکمراں ہے جس نے عوام کی مرضی کے مطابق ایک ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی، اور یہ کام اس نے اپنے عہد کے اس سیاسی اصول سے ہٹ کر انجام دیا کہ سیاسی اتحاد بغیر مذہبی یکسانیت کے قائم نہیں ہوسکتا، وہ تنگ نظری پسند نہ کرتا تھا، اسی لیے اس کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ صرف اس کے ہم نسل ہی اپنے کو ارکان حکومت سمجھیں، بلکہ ملک کے تمام باشندے ملک کے مشترکہ مفاد کو سامنے رکھ کر اس کے خیرخواہ رہیں، اس طرح اس نے ہندوستانی قومیت کے لیے راستے ہموار کیے، موجودہ دور کے مورخوں میں "شیر شاہ" کے مصنف کالکارنجن قانون گو

نے لکھا ہے:۔

"شیر شاہ پہلا حکمراں ہے جس نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنانے کی کوشش کی، یہ امتیاز اکبر کو دیا جاتا ہے، اور شیر شاہ کے لیے یہ دعوی فضول سا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بظاہر اس نے جزیہ لینا بند نہیں کیا، گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا، سنسکرت زبان کی کوئی ایسی سرپرستی نہیں کی جس سے ہندو اور مسلمان دونوں میں کلچرل اتحاد اور علمی یگانگت پیدا ہوئی، اس نے ہندو مسلمان میں شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، اور یہ تمام باتیں اکبر کی جانب منسوب ہیں، لیکن شیر شاہ صحیح معنوں میں ایک مدبر تھا، اس نے علاء الدین کے چراغ کے ذریعہ ایک رات میں کوئی ہوائی قلعہ تیار کرنے کی سعی نہیں کی، بلکہ ایک ایسا جاندار اور عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جس نے ہندوؤں میں سیاسی اور اقتصادی خوشحالی خود بخود پیدا ہو گئی، اس نے ہندو مسلمانوں کو متحد رہنے پر آمادہ کیا، اس طرح اس نے ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈالی اور اس کے لیے جتنی چیزیں ضروری تھیں، ان سب کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔"

شیر شاہ نے جو فضا پیدا کی تھی، اسی کو اور بھی زیادہ خوشگوار بنانے کی ضرورت تھی، اس نے ہندو مسلمان کے اتحاد و یگانگت کی جو بنیاد ڈالی تھی، اسی کو اور مستحکم بنانا تھا، لیکن اکبر نے شیر شاہ سے علیحدہ ایک شاہ راہ بنانے کی کوشش کی اور اس کے نتیجہ پر بحث کرتے ہوئے کالکارنجن قانون گو رقمطراز ہیں:

اگر اکبر غلط قدم نہ اٹھاتا تو ہندوستان کی قومیت سترہویں صدی عیسوی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی، اکبر نے جزیہ بند کر دیا ہوتا، یا ذبیحۂ گاؤ رکوا دیا ہوتا، اپنے نظام حکومت میں ہندوؤں

کو ایک حد تک شریک کر لیا ہوتا، یا سنسکرت زبان کی سرپرستی میں لگا رہتا تو یہاں تک کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن اس کے عجیب و غریب خیالات نے اس کو ایک نئے مذہب کا پیغمبر بنا دیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ رعایا کا سیاسی حکمراں بھی رہا، اور یہی خیالات اسکی اسکیم کی تباہی کے باعث بنے، اس نے کوئی متحدہ قوم نہیں بنائی بلکہ اسکی اسکیم سے ایسے چند مکار مسلمان اور غلامانہ ذہنیت کے ہندو ضرور پیدا ہوئے جو اس کو خوش کرنے کے لئے اللہ اوپ نشد لکھا کرتے تھے۔"

آگے چل کر کالکارنجن نے ایک غیر جانبدار مورخ بنکر اور تمام جذبات سے خالی ہو کر جو کچھ لکھا ہے اس کو مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے جذبات کی بھی ترجمانی سمجھنا چاہیے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اکبر نے اسلام کے ساتھ ناانصافی کی، اس کو خوامخواہ رسوا کیا جس کے لیے اسکی تاریخ اس کو معاف نہیں کر سکتی، اس نے جو کچھ کیا ریاست کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ ایک وہم کو پورا کرنے کے لیے کیا، اسکی پالیسی کی وجہ سے ہندو اور مسلمان تخت کو اتحاد و اتفاق کا مرکز سمجھنے میں بالکل قاصر رہے، ہندو تو اس کی جانب مائل ہوئے لیکن مسلمانوں کی رغبت جاتی رہی، اکبر کا اسلام سے انحراف اس کی غیر معمولی ذہانت کا اچھا نمونہ نہ تھا، اس کو اپنی نجی زندگی میں سچا مسلمان ہونا چاہیے تھا، اگر وہ واقعی ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی خوشگواری اور پائداری کا خواہاں تھا، تو اسے اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا چاہیے تھا، لیکن اس کی تعمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی تھی، اگر وہ خود اسلام کا سچا پیرو بنا رہتا تو مسلمان اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، اس میں مسلمانوں کو نیت کا اخلاص نظر نہیں آیا، بلکہ اس کو اسلام کا غدار تصور کرنے لگے، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ وہ اسلام کی فلاح اسی میں سمجھنے لگے کہ گائے کا گوشت کھائیں اور

ہندوؤں کی ہر چیز سے نفرت کریں، یہیں سے ہندوستانی قومیت کا خاتمہ ہوگیا، اگر اکبر کا جانشین دارا ہوتا تو خاندان بابری ایک بار پھر در بدر کر دیا جاتا، اکبر کے مرنے کے بعد اس کی پالیسی کا ردعمل بالآخر اورنگ زیب کی صورت میں ظاہر ہوا،

دین الٰہی ہندو مسلمانوں میں جگہ نہ پا سکا، اور یہ فطری موت مر گیا، لیکن جہانگیر اور شاہجہاں کے رواداری اور مصالحانہ رویہ سے ہندو مسلم کا پھر ایک ملا جلا معاشرہ خود بخود پیدا ہونے لگا تھا، ضرورت تھی کہ اس میں مزید سیاسی، معاشرتی، عمرانی اور اجتماعی رواداری سے اور بھی قوت نمو پیدا کی جاتی، لیکن اکبری عہد کے تلخ تجربہ کے بعد داراشکوہ نے ایک بار پھر ہندو مت اور اسلام کو ملا کر مذہب کا ایک نیا سنگم بنانے کی کوشش کی جس سے راسخ العقیدہ مسلمان اس سے مشکوک اور بدظن ہو کر اورنگ زیب کی طرف مائل ہوگئے، اب اورنگ زیب مسلمانوں کا ہیرو بن گیا ہے، جس کو ہندو مورخین کسی حال میں بھی اچھا حکمراں کہنے کو تیار نہیں ہیں، اور وہ اس کو ہندوؤں کا بہت بڑا مخالف ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جس سے مسلمان اور مسلمان مورخین دونوں کو انکار ہے، اور یہ ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ مسلمان جس کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں اس کو ہندو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، اور ہندو جس کو اپنا ہیرو تصور کرتے ہیں اس کو مسلمان اچھا تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں،

ہندو مسلمان کو ملے جلے مذہب کے ذریعہ سے ملانے کی ناکام کوشش تو برابر ہوتی رہی، لیکن صحیح طور پر ایک دوسرے کو سمجھ کر سمجھانے کی باضابطہ کوشش نہیں ہوئی، البیرونی اور ابوالفضل نے ہندوؤں کے مذہب کا گہرا مطالعہ ضرور کیا لیکن ان کا رنگ تحقیقی اور علمی ہے، اور پھر انھوں نے کچھ ایسی مشکل زبان میں قلمبند کیا ہے کہ عام طور سے لوگ انکو سمجھ نہ سکے، اس طرح اسلام کی خوبیاں صحیح طور پر ہندوؤں تک نہیں پہنچیں، اسی لیے دونوں ایک دوسرے کیلئے نازیبا اور نامناسب الفاظ استعمال کرتے رہے، ہندوؤں کو کافر سمجھکر بعض مسلمانوں نے

ان کے لیے جو ناخوشگوار الفاظ استعمال کیے، ان کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کو چنڈال اور ملیچھ جیسے الفاظ سے یاد کرنے میں خوش ہوتے، اور ان کے جو جذبات مسلمانوں کے خلاف مرتب ہوتے رہے، ان کی ترجمانی موجودہ دور کے ایک بڑے مورخ آر، سی موزمدار کی حسب ذیل تحریر سے ہوگی،

"گیارہویں صدی کے شروع ربع میں ہندوستان کے لیے ایک بڑا المیہ پیش آیا، اور یہ المیہ ایسا تھا جس سے مستقبل میں بڑے نتائج پیدا ہوئے، اس سے نہ صرف ہندوستان کی دولت اور انسانی قوت جاتی رہی، بلکہ مسلمانوں کو پنجاب میں مستقل طریقہ سے پاؤں جمانے کا ایک موقع مل گیا، جہاں سے ان کو اندرون ملک کے لیے ایک شاہراہ مل گئی،........ کچھ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو شکست دی، اور ان کی جارحانہ معرکہ آرائیوں کو روکا، ان ہی راجاؤں میں سے ایک نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے ملیچھوں (مسلمانوں) کو نکال باہر کیا ہے، تاکہ آریہ ورت کا نام پورا پورا اس پر صادق ہو، اور یہ آریاؤں کا مسکن رہے، لیکن اس قسم کے قومی شعور کی مثالیں کم ملتی ہیں، اسی لیے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈینگ ہانکنے کے بجائے ہندو راجاؤں نے اس کی فکر کوشش نہیں کی کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال کر اپنے گوشت سے کانٹا بھی نکال پھینکتے، بہت سے مواقع آئے جب کہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا تھا...... لیکن طاقتور ہندوستانی راجاؤں نے ڈیڑھ صدی تک ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے ہمسایہ راجاؤں کو نقصان پہنچا کر اپنی حکومت کے دائرہ کی توسیع کی فکر میں لگے رہے، اور انھوں نے اس قومی فریضہ کو انجام دینے کی طرف مل کر پوری توجہ نہیں کی کہ ایک غیر ملکی مذہب کے بیرونی لوگوں

کی غلامی سے پنجاب کو آزاد کراتے........ (ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل جلد پنجم، تمہید از ڈاکٹر آر، سی موجمدار ص XLV)

اور پھر آر. سی. موزمدار یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اسلام کے پیغمبر بہت ہی غیر روادار تھے، وہ اپنے زمانہ کے کسی مذہب کو روا نہیں رکھتے تھے (ہسٹری آف انڈین پیوپل اینڈ کلچر ج ۵ ص ۵۹)

اور عام ہندو مورخین اس کو ثابت کرنے میں پیش پیش ہیں کہ اسلام کی اسپرٹ جنگ جویانہ اور جنگ پسندانہ ہے، اسی لیے کے. ایم. منشی کی نگرانی میں جو ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیوپل لکھی جا رہی ہے، اس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان فاتحین اور سلاطین نے اپنی وحشی فوجوں کے ذریعہ سے گاؤں جلائے غارتگری کی، لوگوں کی دولت لوٹی برہمنوں، بچوں اور عورتوں کو قیدی بنایا، ان کو تسموں اور کچے چمڑے کے کوڑوں سے پٹوایا، قتل عام کرایا، شاندار مندروں کو منہدم کرکے ان کو جلا دیا، عورتوں کی بے حرمتی کی، بازاروں میں کنیز بنا کر فروخت کیا، وہ اپنے ساتھ ایک سفری قید خانہ لیے پھرتے تھے، اور ان قیدیوں کو بھر زبردستی مسلمان بنا لیتے تھے،

یہ تحریریں ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۷ء کی ہیں، جس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے پہلے جو انصاف پسند ہندو مورخین کی تحقیقات ہیں، ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور اب ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو ایک نئے انداز اور نئے رنگ میں پیش کیے جانے کی نئی کوشش ہو رہی ہے، جو کسی حال میں بھی ملکی مفاد کے لیے مناسب نہیں۔

ہندو مسلمانوں میں جو ہم آہنگی نہ ہو سکی، اس کی بڑی وجہ ابو الفضل کے الفاظ میں یہ بتائی جا سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف اور ناآشنا ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے خیالات سے لاعلم رہے، اور اس لاعلمی نے دشمنی اور مخالفت کا سنگ بنیاد رکھا،

جامد تقلید کی وجہ سے عقل و دانش کی شمع گل ہو گئی، اور تحقیقات کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں، اور مسائل کی تحقیق پر رد و قدح کرنا گناہ اور کفر میں داخل ہو گیا ہے، اور مہر و محبت کے ساتھ معتقدات پر تبادلۂ خیالات کرنا، اور اغیار کے چون و چرا کو حق شناسی کی ترازو میں تول کر صحیح نتیجہ پر پہنچ کر ہدایت حاصل کرنا بالکل مفقود ہو گیا، اسی لیے ہر شخص صرف اپنی ہی جماعت کو مخلوق خدا سمجھنے لگا، اور اغیار کو خالق مطلق کے دائرۂ بندگی سے خارج کر کے خون ریزی اور آبروریزی، مردم آزاری ہی کو مذہبی فرائض میں داخل کر لیا، اور انھیں تباہ کن افعال کو سرخروئی دارین کا وسیلہ سمجھتا رہا، ابو الفضل اپنے عقائد کے لحاظ سے بدنام ہے، لیکن اس کے یہ خیالات غور طلب ضرور ہیں،

اور اب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، لیکن وقتاً فوقتاً ایسے اہل دل بھی گذرتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے عقائد میں راسخ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلمانوں دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنے کا درس دیا، ان میں سے امیر خسرو کے بعد نمایاں نام مرزا مظہر جانجاناں (المتوفی ۱۱۹۵ھ) کا ہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوؤں کی بت پرستی اسلام سے پہلے کے عربوں کی بت پرستی سے مختلف ہے، پھر راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے شریعت اسلام ہی کو قابل تقلید اور بقیہ تمام شریعتوں کو منسوخ سمجھتے رہے، لیکن ہندوؤں کے اوتاروں کے احترام کرنے کی یہ کہکر پوری تلقین کی ہے، کہ گذرے ہوئے لوگوں پر بغیر اسکے کہ شرع سے کفر ثابت ہو کفر کا حکم لگانا جائز نہیں، مقامات مظہری میں ہے کہ ایک روز مرزا صاحب کے سامنے کسی خواب کا ذکر آیا کہ ایک صحرا ہے جس میں آگ جل رہی ہے اور کرشن اس آگ میں ہیں اور رام چندر کنارے پر کھڑے ہیں، مرزا صاحب نے

اس خواب کی تعبیر یہ بیان کی کہ صحرا کی آگ عشق و محبت کی حرارت ہے، کرشن کی زندگی عشق و محبت کی زندگی تھی، اس لیے آگ کے اندر دکھائی دیے، اور رام کی زندگی تیاگ و ایثار کی زندگی تھی، اس لیے راہ سلوک میں کنارے کھڑے نظر آئے، پھر فرمایا کہ قرآن شریف میں ہے کہ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ. اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں کوئی بشیر و نذیر ضرور آیا ہوگا، اور ممکن ہے کہ رام چندر اور کرشن ہی نبی رہے ہوں، رام چندر ابتدائی عہد میں دنیا میں بھیجے گئے، جبکہ لوگوں کی عمریں دراز اور طاقت و توانائی زیادہ ہوتی تھی، اس لیے انھوں نے لوگوں کی تربیت سلوک کے طریقہ کے مطابق کی، کرشن اس وقت دنیا میں آئے جب عمر کوتاہ اور قوت ضعیف ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کی تربیت جذبہ کے مطابق کی، ان کی موسیقی اور بانسری ان کے جذب و مستی کا ثبوت ہیں، مرزا صاحب وید کو الہامی کتاب مانتے تھے. اسی لیے ہندوؤں کو اہل کتاب سمجھتے رہے۔

ہندوؤں میں بھی اہل دل ایسے رہے جو اسی قسم کی تعلیم دیتے رہے، مثلاً درگا داس نے اپنی کتاب مخزن الاخلاق میں لکھا ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ اپنے دل کو کدورت کے زنگ سے صاف کرکے ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے ساتھ برادرانہ سلوک رکھے، مخالفت کے خارزار سے اپنے آپ کو علحدہ کرکے اتفاق کے بوستان جنت نشان میں قیام کرے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا

وہ جب کسی مذہب کی عبادت گاہ میں پہنچے تو اس کی عزت و احترام کرے اور جب کسی مذہب کے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو تو ان کی پوری تعظیم و تکریم کرے، دینی معاملات میں کسی سے نہ الجھے اور ان بے کار جھگڑوں سے بیگانگی کے تعلقات میں

بیگانگی پیدا نہ ہونے دے۔

لیکن یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ایسی آوازیں ہندوستان کے باشندوں کے کانوں تک تو ضرور پہنچیں، لیکن وہ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکیں، ورنہ ظاہر ہے کہ کئی ہزار میل سے انگریز جیسی اجنبی قوم ہندوستان میں داخل ہو کر نہ چھا جاتی،

تتمہ: حضرات! یہ مقالہ زیادہ طویل ہو گیا، اس میں اصل موضوع سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں قلم سے بے اختیارانہ طور پر نکل آئی ہیں، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، لیکن دکھانا یہ مقصود تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ان کی سیاسی، مذہبی اور روحانی طاقتوں کی نشو و نما سلاطین، علما، اور صوفیہ کے ذریعہ سے ضرور ہوئی، لیکن پھر ان تینوں گروہوں میں جتنی ہم آہنگی ہونی چاہیے تھی، وہ نہ ہو سکی، ضرورت اس کی تھی کہ سلاطین، علما، کی مذہبی حمیت اور ایمانی حرارت سے پورا فائدہ اٹھاتے اور علما، سلاطین پر تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی اقتدار کا بہتر سے بہتر مصرف لے کر مسلمانوں کی مذہبی غیرت کا صحیح امالہ کرتے رہتے، اسی طرح اکابر صوفیہ کو وہ تعاون کرتے، کیونکہ مسلمانوں میں روحانی قوتیں ان ہی سے پیدا ہوتی رہیں، ان سے سلاطین اور علما، دونوں کو پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، اس ہم آہنگی سے عام مسلمانوں کا ایک صالح، پائدار اور جاندار معاشرہ لازمی طور پر تیار ہو جاتا، جس سے اچھے سلاطین، اچھے امراء، اچھے علما، اور اچھے صوفیہ بھی پیدا ہوتے رہتے، جو عام سیاست اور معاشرت کے نگہبان بن کر اس کو زوال سے بچائے رکھتے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغلوں کے آخری دور حکومت میں عام مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی بھی کھوکھلی ہو چکی تھی اور نہ وہ خود سیاست کو سنبھال کر اس کو ایک غیر قوم کے استیلاء سے محفوظ

رکھ سکتے تھے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے پورے دور حکومت میں ایک ذہنی بحران میں مبتلا رہے، ان کا دماغ سلاطین کی طرف رہا، کیونکہ ان ہی کے ذریعہ ان کو دنیا ملتی تھی لیکن جن کے ذریعہ ان کو دین ملتا، وہ ان سلاطین کی حکومت کو فکری طور پر غیر اسلامی سمجھتے، اور پھر جن سے مسلمانوں کی روح کی جلا ہوتی، وہ یعنی صوفیہ ان دونوں سے الگ ہوتے چلے گئے، ان فطری اختلافات سے مسلمان ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے، وہ کبھی اپنے جان و مال کے نگہبان، کبھی اپنے ایمان کے پاسبان اور کبھی اپنی روح کے محافظ کو تاکتے، اور زبان حال سے ان تینوں میں ہمنوائی اور باہمی تعاون کے خواہاں ہوتے، لیکن کوئی تحریک اور کوئی قوت ایسی پیدا نہیں ہوئی جو ان میں ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر یگانگت پیدا کر دیتی، اسی لیے مسلمان کبھی بادشاہ کے ساتھ ہو جاتے، کبھی علماء کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے اور کبھی صوفیہ کا دامن تھامتے، اس ذہنی بحران کی وجہ سے ان میں اجتماعی مقصدیت اور مرکزیت نہ پیدا ہو سکی، وہ برسر اقتدار اسی وقت تک رہے جب تک ان کے حکمرانوں کی قوت برقرار رہی، اور جب یہ قوت کمزور ہو گئی تو انھوں نے خود محسوس کیا کہ ان کے قوائے عمل شل ہو کر رہ گئے ہیں، اور ان میں وہ کردار، بلند اخلاق اور اعلیٰ فکر و عمل نہیں رہے جن کی وجہ سے حکمراں کے نااہل ہونے کے باوجود حکومت کو برقرار رکھ سکیں،

اور ایک بہت ہی شاندار حکومت ختم ہو کر رہ گئی، اکبر کے زمانہ میں یہی حکومت اپنے زمانہ میں دنیا کی طاقتور ترین حکومت سمجھی جاتی تھی، اورنگ زیب کے ناقد جدوناتھ سرکار کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس کے عہد میں مغلوں کی سلطنت کا رقبہ سب سے زیادہ تھا، اور ہندوستان کی پوری تاریخ میں یہاں برطانوی حکومت سے پہلے

کبھی اتنی بڑی سلطنت قائم نہ ہوئی تھی، غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک کا پورا علاقہ ایک ہی تاج و تخت کے ماتحت تھا، اور پھر دور دراز علاقوں میں لداخ اور ملابار میں بھی منبروں پر اسی بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا،

لیکن یہ سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتی رہی، اس کے زوال کا الزام اورنگ زیب کے بعد کے ناکارہ حکمرانوں پر آتا ہے، کہ انھوں نے جانشینی کی خونریز لڑائیاں لڑ کر حکومت کو نقصان پہنچایا، نفاق پرور، مفاد پرست اور راحت پسند امرا، کو دربار میں جمع کر کے اس کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا دیا، طریقۂ جنگ میں جو ترقی ہوتی رہی اس سے وہ بالکل بے خبر رہے اور شمشیر و سنان کو چھوڑ کر طاؤس و رباب میں پڑ گئے وغیرہ،

لیکن اس زوال کی ذمہ داری علماء، صلحاء اور صوفیہ پر بھی عائد ہوتی ہے، وہ اچھی معاشرت بناتے رہتے تو حکومت بھی اچھی رہتی، مگر علماء اچھی معاشرت بنانے کی جد و جہد کے بجائے زیادہ تر جزوی اختلافات میں مبتلا رہے، حرام و حلال کے مسائل میں وہ ایسے الجھے کہ عام لوگوں کو دین میں صرف خشکی ہی خشکی نظر آتی، اور وہ اس کے دائرہ میں آسانیاں کم اور دشواریاں زیادہ پا کر اپنی زندگی کو تنگ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے، علماء نے مذہب اور شریعت کی گہرائیوں کو سمجھ کر غور و فکر سے کم کام لیا، انھوں نے معاملات اور اعمال حسنہ پر کم اور عقائد و عبادات پر زیادہ زور دیا، ان کی درسگاہوں میں تعلیمی نصاب بھی ضرورت زمانہ کا لحاظ کیے بغیر بالکل جامد رہا، اسی لیے وہ زیادہ تر حواشی اور تعلیقات ہی لکھنے میں مشغول رہے، اور صرف، نحو، معانی اور یونانیوں کے علوم میں کچھ ایسے ڈوبے کہ احیائے دین اور تجدید یقین کے لیے جس اجتہاد کی ضرورت تھی، اس کو اجتماعی طور پر عمل میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کی، وہ سلاطین کی حکومت

سے بدظن ہو کر خلافت راشدہ کے طرز حکومت کے خواہاں تو ضرور رہے، لیکن اس طرز حکومت کے لیے خلافت راشدہ کی معاشرت بھی پیدا کرنے کی ضرورت تھی، جو علما، و صلحا، کے ذریعہ ہی بن سکتی تھی، لیکن وہ صرف محراب و منبر کی زینت اور درس و تدریس کی مسند پر متمکن رہنے ہی پر اکتفا کرتے رہے، اور ان کی نظر سلاطین کی طرف اٹھی رہی کہ وہ اچھی حکومت کے ساتھ اچھی معاشرت بھی بنائیں، لیکن سلاطین کے ذریعہ صالح معاشرت کا بننا ممکن نہ تھا، وہ معاشرت میں حسن عجم تو پیدا کر سکتے تھے، لیکن سوز دروں عرب علماء اور صلحاء ہی کی وساطت سے پیدا ہو سکتا تھا، مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے عہد کا اتباع سنت اور زہد و تقوی کے ساتھ اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، خلق اللہ کی خدمت گزاری، مخالفین کے ساتھ حسن سلوک، مصیبت کے وقت صبر و تحمل، معاملات میں دیانت و صفائی کا پیدا کرنا علماء ہی کے بس کا تھا، منبر پر بیٹھ کر وہ ان باتوں کی تلقین تو کرتے رہتے، لیکن ان کی دعوت میں عزیمت نہیں تھی، اسی لیے وہ مسلمانوں میں وہ سوز و مستی اور جذب و شوق پیدا نہ کر سکے، جن سے وہ صحیح معنوں میں مومن بنکر صاحب لولاک ہوتے، اور حکومت کو برائیوں سے بچا کر اسکے نگہبان و پاسبان بھی بنے رہتے،

شروع میں صوفیاے کرام نے اچھی معاشرت ضرور بنائی، لیکن آخر میں وہ بھی غیر موثر ہو گئے تھے۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

(اقبال)

القاضی الرشید

مؤلف کتاب الذخائر والتحف

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پارلیس

تین سال کا عرصہ ہوا، معارف میں عنوانِ بالا پر متعدد اہل علم نے داد تحقیق دی تھی، اسکے بعد میرے پاس کچھ نیا مواد جمع ہوا ہے، معارف کے علم پرور صفحات سے توقع ہے کہ یہ معلومات بھی اہل نظر تک پہنچائی جائیں گی، "تاکہ جو لوگ اس سے استنباط کر سکتے ہیں وہ اسے جان لیں"۔

البتہ ان ناظرین کے لیے جو پہلی دفعہ اس بحث سے دوچار ہوں گے، دو چار تمہیدی باتیں عرض کی جائیں تو تکرار بے محل غالباً نہ ہوگی، قصہ یہ ہے کہ ترکی کے شہر افیون قرہ حصار کے کتبخانے میں ایک نایاب مخطوطہ "کتاب الذخائر والتحف" ہے، کتاب میں اس کے مولف کا ذکر نہیں، ناچیز نے اسے طباعت کے لیے مرتب کیا، اور کویت کی حکومت نے ۱۹۵۹ء میں اسے شائع کیا، اس سے بہت پہلے ۱۹۵۳ء میں اس کا ایک اقتباس "برتا ملکۂ روما کا خط المکتفی باللہ خلیفۂ بغداد کے نام" کے عنوان سے کراچی کے انگریزی رسالے "جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" میں شائع کرتے ہوئے میں نے اس مجہول الحال کتاب کو الاوحدی کی طرف منسوب کیا تھا، کیونکہ کتاب میں اس کا کچھ مبہم سا ذکر ہے، (اس مضمون کے اطالوی اور فرانسیسی ترجمے بھی چھپے اور اس پر علمی حلقوں میں کافی بحثیں بھی ہوئیں، پھر جب ۱۹۵۹ء میں کتاب کے چھپنے کی نوبت آئی تو میں نے اسے

بعض حوالوں کی بنا پر القاضی الرشید بن الزبیر کی طرف منسوب کرنے کی جسارت کی اور لکھا کہ یہ فاطمی دور کا ایک مؤلف ہے جو ۴۶۳ھ تک زندہ تھا، معارف میں ایک اہل علم نے اس پر تنقید کی اور ضمناً اسے ۵۶۳ھ میں فوت ہونے والے ایک مؤلف کی طرف منسوب کیا،

میں اس مضمون میں نہ افراد کی بحث میں پڑوں گا نہ انفرادی آراکی تدقیق کی ناخوشگوار خامہ فرسائی میں صرف تالیف اور مولف کا ایک عام اور ممکنہ حد تک جامع تبصرہ مقصود ہے،

کتاب کے مندرجات | کتاب کا پورا نام ہے "کتاب الذخائر والتحف وما کان بالقصر من ذالک"۔ اس کے دیباچے میں مولف نے بیان کیا ہے کہ اس میں قیمتی تحفوں اور ہدیوں کا، شادیوں دعوتوں، ختنہ کی رسموں اور بچوں کے ختم قرآن کی تقریبوں کے مصارف کا، یادگار زمانہ دنوں کا، عجائب و غرائب کے ذخیروں کا، دولتمندوں کی وفات کے بعد ان کے یہاں سے برآمد ہونے والے خزانوں کا، غنیمت اور فتوحات میں حاصل ہونے والی قیمتی چیزوں کا اور (فاطمی) امام المستنصر باللہ کے محل سے ۴۶۰ھ اور ۴۶۱ھ کے ہنگاموں کے موقع پر لٹنے والے نوادرات کا ذکر ہے۔

اگر یہی ہوتا تو بھی بڑا دلچسپ مواد تھا لیکن کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ پُر از معلومات ہے، اس میں نہ صرف ترکستان، ایران وغیرہ اسلامی ممالک کے غیر معروف لیکن اہم واقعات کا ذکر ہے، بلکہ چین اور یورپ کے اہم واقعات کا بھی ذکر ہے، یورپ کے (۲۶) واقعات اس کتاب میں ہیں، جن میں گیارہویں صدی عیسوی کے یورپ کی معاشی، صنعتی اور سماجی تاریخ کے متعدد ایسے پہلوؤں کا بیان ہے جن سے خود یورپ کی تاریخیں خالی ہیں، اور یہ خلا اس کتاب سے پُر ہوتا ہے، بلاط الشہداء کے عبد الرحمٰن الغافقی کے بورڈو فتح کرنے کا بھی اس میں ذکر ہے، فرانس، اٹلی، صقلیہ اور اسپین کے بھی ایسے حالات ہیں جو کسی اور ماخذ میں نہیں ملتے اور یہ سب سرکاری دستاویزوں پر مبنی ہیں،

مؤلف کا نام | کتاب کے مولف کا کہیں ذکر نہیں، سرورق پر ایک جدید الخط حوالے میں، بظاہر

کتب خانہ افیون قرہ حصار کے فہرست نگار نے، اسے شیخ شہاب الدین احمد بن عبد اللہ بن حسن الاوحدی المقریٔ الشافعی کی طرف منسوب کیا ہے، وہیں ایک پرانے سے خط میں ہے کہ یہ مولیٰ ابراہیم بن محمد بن آیدمیر العلائیؒ المعروف بابن دُقماق کا نقل کردہ نسخہ ہے، (اوحدی کی وفات ۸۱۱ھ میں اور ابن دقماق کی ۸۰۹ھ میں ہوئی)

مگر پیچیدگی کتاب کے آخر کی ایک تحریر سے شروع ہوتی ہے، جس میں لکھا ہے کہ "کتاب الہدایا والتحف کا جو حصہ دستیاب ہوا، یہ اس کا انتخاب ہے"، سرورق پر ذخائر و تحف نام تھا، اس تحریر میں اس کو ہدایا و تحف کر دیا گیا ہے،

اس خاتمۂ کلام کے بعد ایک ضمیمہ ہے، اس میں تحریر ہے کہ کتاب الہدایا والتحف کے دستیاب شدہ حصے پر یہ اضافہ ہمارے صاحب (یعنی رفیق) امیر کبیر شہاب الدین احمد بن عبد اللہ ابن الحسن الاوحدی المقریٔ الشافعی کے انتخاب کردہ معلومات کے ذریعے سے کیا گیا ہے، دو صفحوں کے بعد "انتہیٰ" پر اس کو ختم کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کوئی حوالہ یا تفصیل نہیں ہے، اگر یہ ضمیمہ اوحدی کا ہے تو پھر اصل کتاب کس کی ہے؟

چونکہ کتاب میں فاطمی خلفاء کے زمانے کے بھی حالات ہیں، اس لیے میں نے مقریزی کی خطط مصر کی طرف رجوع کیا، کیونکہ "الضوء اللامع" میں سخاوی نے اوحدی کے حالات میں لکھا ہے کہ اوحدی نے خطط مصر پر بڑی محنت سے ایک کتاب لکھی تھی، اور صرف ایک حصے کا مبیضہ کیا تھا کہ اس کی وفات ہو گئی، اور مقریزی نے اسی کو اپنی طرف منسوب کر لیا، اوحدی فوجی وردی میں رہتے تھے، اور بحالت افلاس ۱۹ رجمادی الاولیٰ ۸۱۱ھ میں وفات پائی، مقریزی نے اپنی کتاب العقود میں سوانح عمریوں کے ذیل میں ان کا کار آمد ذکر کیا ہے (مقریزی کی درر العقود الفریدہ فی تراجم الاعیان المفیدہ اب ناپید ہے، اس کا صرف ایک ٹکڑا مشرقی جرمنی کے شہر گوتا میں ہے، اگرچہ میں نے اسے دیکھا نہیں

لیکن میرے علم میں وہ اوحدی سے متعلقہ حصے سے خالی ہے،)

بہر حال خطط مقریزی (طبع بولاق) میں تلاش سے ہماری پیش نظر کتاب کے کوئی دس بارہ اقتباس ملے (دیکھو جلد اول صفحات ۴۰۸، ۴۱۳، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۸، ۴۹۲)، یہ عبارتیں "کتاب الذخائر" کے حوالے سے نقل کی گئی ہیں (جو ہماری کتاب کا بھی نام ہے) لیکن مولف کے نام کا کہیں حوالہ نہیں ہے (ص ۴۲۴) پر ایک اور اقتباس ہماری کتاب کا ہے لیکن مقریزی نے اس میں ماخذ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے، البتہ اس قصہ کا تکملہ (جو ہماری کتاب میں نہیں ہے) القاضی المہذب کے حوالے سے نقل کیا ہے،

مقریزی پر روسی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ میں کافی چیزیں لکھی گئی ہیں، اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مقریزی کے ماخذ معلومات کا پتہ چلایا جائے، اس سلسلہ میں لندن کے رسالہ JRAS ۱۹۰۲ء صفحہ (۱۰۳ تا ۱۲۳) میں ایک مضمون ہے "خطط مقریزی میں مذکورہ مولفوں اور تالیفوں کا ذکر"۔ اس میں مضمون نگار گیسٹ (GUEST) نے لکھا ہے "الذخائر والتحف کے مؤلف کا نام معلوم نہیں، ممکن ہے کہ یہ مجلی بن جمیع کی ذخائر ہو"۔ اگر مضمون نگار صاحب ذرا تحقیق کر لیتے تو کشف الظنون ہی سے معلوم ہو جاتا کہ مجلی بن جمیع کی کتاب الذخائر فقہ شافعی کی کتاب ہے، اس کو تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں،

اوپر میں نے ملکہ برتا کے جس قصے کا ذکر کیا ہے، اس کا مختصر ذکر ابن ندیم نے بھی کیا ہے، اور اس کی اساس پر روسی مولف بارتولد نے چیکوسلواکیا کے ایک رسالے میں ایک مضمون لکھا ہے میں نے اسے پڑھا، لیکن اس میں ظاہر ہے کہ مقریزی کے ماخذ پر بحث نہیں ہے، پھر ایک اور روسی مولف انوسترانسیف (INOSTRANCEV) نے روما کے رسالہ RSO ۱۹۱۱ء میں فرانسیسی زبان میں ایک مضمون اسی ملکہ برتا پر لکھا ہے، اور الغزالی کی مطالع البدور میں بھی اس قصے کے وجود کا ذکر کیا ہے، جب میں نے اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا تو اس میں بھی ہماری

کتاب کے ایک دو نہیں بیس تیس مقاموں پر اقتباس نظر آئے، اور آٹھ مقاموں پر تو ان کے ماخذ کا ذکر بھی ملا (دیکھو مطالع البدور، جلد اول صفحہ ۵۸، ۶۱، ۱۳۸، ۲۳۳، نیز جلد دوم ص ۴۰، ۶۵، ۱۶۲، ۱۸۹)۔ ان میں سے سب سے پہلے اقتباس میں ہے: "دسواں باب مسند، تکیے اور فرش" القاضی الرشید ابو الحسین احمد بن القاضی الرشید بن الزبیر نے اپنی کتاب العجائب والطرف والہدایا والتحف میں بیان کیا ہے کہ ......" دوسرے حوالوں میں بھی مولف یا عنوان کتاب کا مختصر ذکر ہے،

اسی کی اساس پر میں نے کتاب الذخائر والتحف کو شائع کرتے وقت اسے القاضی الرشید ابن الزبیر کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کی، اور چونکہ کتاب میں مولف نے ۴۴۴ھ تا ۴۶۳ھ تک چشم دید حالات لکھے ہیں، اس لیے میں نے قیاس کیا کہ مؤلف کی وفات ۴۶۳ھ کے بعد ہونی چاہیے، وہ حوالے یہ ہیں:-

(۱) بادشاہ میخائیل نے اس سفیر کے ہاتھوں ۴۴۴ھ میں[۱] ..... بہت قیمتی تحفے بھیجے جن کا میں نے خود تنیس میں مشاہدہ کیا، "شاہدتُ" (دیکھو کتاب الذخائر ص۵) [مشاہدہ یقیناً سوا سو سال بعد نہیں ہو سکتا، سفیر کی آمد کے لگ بھگ زمانے ہی میں ہونا چاہیے]

(۲) خطیر الملک نے مجھے اطلاع دی (اخبرنی) .... جبکہ وہ شام سے ذیقعدہ ۴۶۲ھ میں تنیس آیا کہ اندلس کے حکمراں اقبال الدولہ علی بن مجاہد نے المستنصر باللہ (فاطمی) کو ایک تحفہ بھیجا .... (کتاب الذخائر ص۹۶)، یہ اطلاع ۴۶۲ھ کی ہے، اور اقبال الدولہ اور مستنصر باللہ کا زمانہ بھی یہی ہے، ۵۶۳ھ میں یہ لوگ زندہ نہ تھے۔

---

[۱] اس حوالے میں کوئی سہو ہے کیونکہ پانچواں میخائیل ۱۰۴۲ء میں مر چکا تھا اور چھٹا میخائیل ۱۰۵۶ء سے قبل تخت نشین نہیں ہوا، زیر بحث ۴۴۴ھ (مطابق ۱۰۵۲ء تا ۱۰۵۳ء) میں نواں قسطنطین بیزنطینی حکمراں تھا، اس لیے یہاں یا تو بادشاہ کے نام میں مولف سے غلطی ہوئی ہے، یا تاریخ میں۔

(۳) انیر الدولہ ابو علی الحسن بن حمدان نے ۴۶۳ھ میں بیزنطینی حکمران رومانوس دیوجینس کو ایک تحفہ بھیجا۔۔۔ (دیکھو کتاب الذخائر صفحہ ۱۰۵) اور ابو الفضل (ابراہیم بن علی الکفرتابی نے مجھ سے بیان کیا (حدثنی)، جبکہ وہ ۴۶۳ھ میں قسطنطنیہ سے دمیاط آیا تھا کہ اس نے رومانوس دیوجینس کو دیکھا کہ .... (کتاب الذخائر صفحہ ۲۶۳) اس حکمران کا یہی زمانہ ہے، اس کے سو سال بعد کا نہیں،

(۴) ایک شخص نے جو جھنڈوں اور بیرقوں سے خوب واقف ہے، مجھے بتایا (اعلمنی) کہ جھنڈوں کے سرکاری ذخیرے میں .... سپہ سالار جوہر کی آمد مصر اور ۳۵۸ھ میں (فاطمی) قصر شاہی کی تعمیر کے بعد سے اب تک (الیٰ ہذا الوقت) جبکہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے ... (کتاب الذخائر صفحہ ۳۷۵)۔ ۳۵۸ھ کے بعد سے "زائد از صد سال" کے معنی ۴۵۸ھ سے کچھ ہی بعد مثلاً ۴۶۳ھ ہو سکتا ہے، ۵۶۳ھ نہیں،

ان اقتباسوں سے واضح ہوتا ہے کہ بیان کنندہ راوی یعنی مولف کتاب ۴۴۴ھ اور ۴۶۳ھ کے درمیان دربار فاطمی کے صیغۂ استقبال سفراء میں مامور تھا،

ایک اور اندرونی شہادت کتاب کے ۵۳ میں ہے، جہاں ایک بے حقیقت اور تقریباً گمنام حکمران کا بڑے طنطنہ خیز القاب کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے: "الملک المعظم شاہنشاہ سلطان دین اللہ وملک عباد اللہ وعضد خلیفۃ اللہ أبو کالیجار بن سلطان الدولۃ بن بہاء الدولۃ بن عضد الدولۃ بن رکن الدولۃ بن بویہ ...."

مولف کا مذہب | یہ ابو کالیجار تاریخ ابن اثیر، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام وغیرہ کے مطابق بغداد میں امیر الامراء رہا ہے (اور غالباً اسی لیے ہمارے مولف کو، جو اس کی پیشی میں ملازم ہوگا، سرکاری محافظ خانے میں ملکہ برتا وغیرہ کے اصل خطوط کے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا) ابو کالیجار اور طغرل بیگ سلجوقی میں لڑائیاں رہیں، ابو کالیجار نے اصفہان اور کرمان فتح کر لیا، لیکن

ایک وبا میں اس کے بارہ ہزار گھوڑے ہلاک ہو گئے، اس لیے اس نے طغرل بیگ سے صلح کر لی، اور طغرل نے ابو کالیجار کی بیٹی سے، اور ابو کالیجار کے بیٹے نے طغرل کی بھتیجی سے نکاح کر کے آپس میں رشتہ بھی کر لیا، ۴۴۰ھ میں کرمان کے مقام خناب میں ابو کالیجار کا انتقال ہو گیا۔ ابو کالیجار کی وفات کے بعد طغرل کا کوئی حریف نہ رہا اور اس کا اثر سارے ایران، عراق وغیرہ میں پھیل گیا، ان حالات میں ابو کالیجار کے کارندوں، خاصکر شیعہ کارندوں کا تنگی سلجوقیوں کے ہاں ترقی یا رسوخ کا کیا امکان ہے، ابو کالیجار شیعہ تھا، اس لیے القاضی الرشید کو بھی اصولاً شیعہ ہونا چاہیے، اور تاریخی مواد بھی یہی ثابت کرتا ہے، (جیسا کہ ابھی بیان ہوگا) اس لیے اگر القاضی الرشید نے سلجوقی علاقے کو خیرباد کہہ کر مصر یعنی فاطمی شیعوں کے ہاں قسمت آزمائی کی کوشش کی تو حیرت کی بات نہ ہونی چاہیے،

"اعیان الشیعہ" ایک مشہور کتاب ہے، (۱۳۸۲)، اس کی جلد نہم صفحہ ۹۴ تا ۹۷ میں سوانح نمبر پر القاضی الرشید کے حالات تفصیل سے ہیں، اس میں لکھا ہے کہ "نسمۃ السحر نامی کتاب کے بیان کے مطابق القاضی الرشید ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے شیعیت قبول کی، اور وہ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا"!

محمد علی تبریزی نے اپنی ریحانۃ الادب (جلد پنجم، صفحہ ۳۵۵ تا ۳۵۶، نمبر ۳۰۰) میں لکھا ہے: "یہ ظاہر ہے کہ وہ شیعہ تھا، اور شیخ محمد محسن طہرانی کی "الذریعہ الیٰ تصانیف الشیعہ"، اور کتاب اعیان الشیعہ میں اس کی تصریح موجود ہے،

ایک دوسری لیکن عالمانہ بحث میں جامعۂ ڈھاکہ کے پروفیسر حنیف اللہ کبیر نے کلکتے کے انگریزی رسالے "انڈو ایرانیکا" میں ۱۹۵۸ء سے بویہی خانوادے پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا، اس کی ۱۹۵۹ء کی جلد میں صفحہ (۲۷) پہ ایک اہم بیان ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:-

"امیر الامراء بننے سے پہلے ابوکالیجار اسماعیلی فرقے کی دعوت سے متاثر ہو گیا تھا۔ یہ دعوت شیراز میں ایک اسمٰعیلی داعی دے رہا تھا، جو اسماعیلیوں کے ہاں المؤید فی الدین الشیرازی کے نام سے مشہور ہے۔ جب ابوکالیجار بصرہ کی بغاوت فرو کر کے تقریباً ۴۳۱ھ میں شیراز لوٹا تو المؤید نے اس سے خط و کتابت شروع کی اور اسے اسماعیلیت قبول کرنے کی دعوت دی، اور یہ بھی بتایا کہ ابوکالیجار کے سارے آبا و اجداد اسماعیلی ہی تھے، (جو ظاہر ہے کہ لغو بات ہے) (دیکھو سیرۃ المؤید صفحہ ۱۳-۱۴) رفتہ رفتہ ابوکالیجار بھی اس دعوت سے متاثر ہو گیا، جو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی دیلمی فوج میں بھی پھیلائی جا رہی تھی، (دیکھو فارس نامہ ص ۱۱۹) لیکن جلد ہی مختلف وجوہ سے ابوکالیجار کو اس داعی سے قطع تعلق کر لینا پڑا، کیونکہ نہ صرف اس کے چند درباریوں نے جس میں شیراز کا قاضی القضاۃ بھی شامل تھا، اسے یقین دلایا کہ یہ داعی اس کی فوج کو بغاوت پر اکسا رہا ہے، بلکہ خلیفہ القائم کو بھی جب داعی المؤید کی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اس نے ابوکالیجار سے خواہش کی کہ اس داعی سے تعلقات منقطع کر لے، (سیرۃ المؤید، صفحہ ۶۳-۶۴) اسی اثنا میں جلال الدولہ کا انتقال ہو گیا، اور ابوکالیجار نے کوشش کی کہ جلال الدولہ کی جگہ خود اسے امیر الامرا بنایا جائے، اور یہ ممکن نہ تھا کہ عباسی خلفاء کے حریف کے فرستادہ داعی سے تعلقات منقطع کیے بغیر اس کی خواہش پوری ہو سکے، (دیکھو سیرۃ المؤید، ص ۶۳-۶۴) اس لیے ابوکالیجار نے حکم دیا کہ اس داعی کو دریائے فرات کے پار ملک بدر کر دیا جائے، اور داعی سے کہا کہ اگر وہ عباسی خلفاء کی سرزمین میں آیا تو اس کو موت کی سزا دی جائے گی (المؤید نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس ملک بدری کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ یہ لکھا ہے کہ "ابوکالیجار نے مجھے ایک خط لکھا کہ مصر میں امام (فاطمی حکمراں) کے ہاں واپس چلا جاؤں، اور کسی دوسرے مناسب وقت پر دوبارہ آؤں (دیکھو سیرۃ المؤید ۶۳-۶۴)

اسی کتاب میں (ص ۷۶ تا ۷۸) پر ایک اور خط ہے جو ابوکالیجار نے داعی کو اس کے مصر جاتے وقت بھیجا تھا، اگر المؤید کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ ابوکالیجار دل سے اس داعی ہی کی طرف میلان رکھتا تھا، اگرچہ سیاسی وجوہ سے اس نے اس سے رخصت ہونے کی خواہش کی تھی"

مؤلف کا عصر اوپر جن شیعہ سوانح عمریوں کا ذکر ہوا، ان میں ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی القاضی الرشید کے حالات ملتے ہیں اور یہ سب اس کی وفات ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ میں، یعنی کتاب کی تالیف کے ایک سو سال بعد بیان کرتے ہیں، مثلاً:-

یاقوت، معجم الادباء، (یا ارشاد الاریب) جلد چہارم ص ۵۱ تا ۶۷

ابن خلکان، وفیات الاعیان، نمبر ۹۴

ابن العماد، شذرات الذہب، جلد چہارم صفحہ ۱۹۷، ایضاً خریدہ ج ۱ ص ۲۰۰ تا ۲۰۲

سیوطی، بغیۃ، صفحہ ۱۴۶، ایضاً حسن المحاضرہ جلد دوم ص ۱۲۳

خوانساری، روضات الجنات صفحہ ۷۶ تا ۷۷

یافعی، مراۃ الجنان جلد سوم ص ۳۶۷ تا ۳۶۹

جعفر الادفوی، الطالع السعید، نمبر ۵۲

الاسنوی، طبقات الشافعیہ، ورق ۶۲/الف

الذہبی، سیر النبلاء ج ۱۲ صفحہ ۲۶۲

ابن سمرہ الجعدی[1]، طبقات فقہاء الیمن، صفحہ ۱۳۰ (مخطوطہ) زمانۂ تالیف ۵۸۶ھ۔

---

[1] یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں مصر میں چھپی ہے، اڈیٹر نے حاشیے میں لکھا ہے کہ القاضی الرشید کے حالات بامخرمہ جلد دوم، صفحہ ۴-۶ میں، السلوک، ورق ۲۳ ۱۲ میں، اور الداعی ادریس کی عیون الاخبار جلد ہفتم ص ۲۰۳ میں بھی ہیں، دیکھو کتاب مذکور ص ۱۶۷

ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، حالات ۵۶۳ھ

ابن تغری بردی، النجوم الزاہرہ، برموقع،

ان میں سے متعدد حوالے میرے مکرم دوست بیروت کے پروفیسر صبحی الصالح نے مہیا کیے، اور جو کتابیں مجھے پارس میں نہ ملیں ان کی ضروری عبارتوں کی نقلیں بھی بھیجیں، جزاہ اللہ خیراً، مذکورہ حوالوں میں القاضی الرشید کے اشعار بھی ہیں، لیکن ان کو ہماری اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے ان کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، بعض حوالے مولانا عبدالعزیز میمن نے بھی ازراہ عنایت بھیجے، جس کے لیے میں ان کا شکر گذار ہوں،

میں ان میں سے صرف پہلے دو اقتباسوں کو یہاں درج کروں گا۔

(الف) یاقوت نے لکھا ہے: "احمد بن علی بن ابراہیم بن الزبیر الغسانی الاسوانی المصری جس کا لقب الرشید، اور کنیت ابوالحسین ہے، .... اس کا صعید مصر کے ایک بڑے اور بہت مالدار گھرانے سے تعلق تھا، اسے اسکندریہ کی بندرگاہ اور دواوین سلطانیہ (سرکاری مرکزی دفتر) کا ناظم بنایا گیا، پھر اس کو ظالمانہ طور پر محرم ۵۶۳ھ میں قتل کیا گیا، اس کی تصانیف مصر سے باہر بھی مشہور ہیں، ان میں کتب ذیل بھی شامل ہیں: منیۃ الالمعی وبلغۃ المدعی، جس میں کئی علوم کا ذکر ہے، کتاب المقامات۔ کتاب جنان الجنان وروضۃ الاذہان چار جلدوں میں مصری شعراء کا تذکرہ۔ کتاب الہدایا والطرف۔ کتاب شفاء الغلۃ فی سمت القبلۃ۔ رسائل جو تقریباً پچاس ورق میں ہے، دیوان تقریباً سو ورق میں، وہ صعید مصر میں اسوان میں پیدا ہوا، پھر ترک وطن کرکے مصر[1] (قاہرہ) میں آباد ہوگیا،

[1] لفظ مصر عربوں کی ایجاد نہیں ہے، یہ بڑا پرانا لفظ ہے، چنانچہ توریت میں قبیلہ مصرایم کا نام آیا ہے، ہندؤں میں جو خاندان مسرا اور مصر جی کہلاتے ہیں، ان کا بھی اس سے رشتہ جوڑا جاتا ہے۔

اور وہاں کے حکمرانوں سے توسل پیدا کیا، اور وزراء کی مدح میں قصیدے لکھے جنھوں نے اسی ترقیاں عطا کیں، چنانچہ اسے "رسالت" (یعنی فاطمی دعوت) کے لیے یمن بھیجا گیا، جہاں بعد میں اس کو قاضی اور گورنر بھی بنایا گیا "قاضی قضاۃ الیمن اور داعی دعاۃ الزمن" کے لقب سے ملقب کیا گیا، رسوخ واقتدار حاصل ہونے کے بعد اس کو خلیفہ بننے کی ہوس پیدا ہوئی، اور اس کوشش میں اس کو کامیابی ہوئی، لوگوں نے اس کو قبول کرلیا، اور اس نے اپنے نام کے سکے ڈھالے جن کی ایک جانب "الامام الامجد ابوالحسین احمد" اور دوسری طرف "قل ہو اللہ احد اللہ الصمد" درج تھا لیکن بعد میں اسے گرفتار کرکے قوص بھیج دیا گیا..... اس کے قتل کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اسد الدین شیرکوہ کی طرف مائل ہوگیا تھا، چنانچہ جب وہ اس ملک میں آیا تو القاضی الرشید نے اس سے خط وکتابت کی ....." اس اقتباس میں اس کی تالیف نمبر ۴ کی طرف خاص کر اشارہ کرنا ہے۔

(ب) ابن خلکان نے اس گتھی کو سلجھانے کی کلید مہیا کی ہے، اس کا بیان ہے کہ "القاضی الرشید ابوالحسین احمد بن القاضی الرشید ابوالحسن علی بن القاضی الرشید ابواسحق ابراہیم بن محمد بن حسین بن الزبیر الغسانی الاسوانی، یہ اچھا عالم اور فرزانہ شخص تھا، بڑے عہدہ پر فائز تھا، اس نے کتاب الجنان وریاض الاذہان تالیف کی جو مشاہیر علماء کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہے، اس کی نظموں کا ایک دیوان بھی ہے، اس کے بھائی القاضی المہذب کا بھی ایک دیوان ہے، العماد نے السیل والذیل میں لکھا ہے کہ شاور نے اس کا شیرکوہ کی طرف میلان دیکھا تو ۵۶۳ھ میں اس کو ظالمانہ طور سے قتل کردیا، اس کا رنگ کالا اور سینہ چوڑا تھا، ہم عصروں میں ہندسہ، ریاضی، علم الادیان، ادب اور شاعری میں اس کا کوئی حریف نہ تھا،

لہٰذا | ان تحریروں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس خاندان میں تین نسل تک مسلسل القاضی الرشید کا لقب جاری رہا، قاضی رشید اول کا پوتا باختلاف روایت ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ

میں فوت ہوا، ایسی حالت میں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہماری کتاب کا مولف پوتا نہیں بلکہ دادا رہا ہو؟
مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے فروری ۱۹۶۱ء کے معارف میں جو تحقیق فرمائی ہے، اس سے اس خاندان کے متعلق کافی حالات معلوم ہوتے ہیں، وہ الادفوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

(الف) "نمبر ۵۲ احمد بن علی بن ابراہیم بن علی بن الزبیر ابو الحسن القرشی الاسدی الاسوانی المعروف بہ الرشید۔"

(ب) "نمبر ۲۹۴ علی بن احمد بن علی الاسوانی، الرشید کا باپ، العماد الاصبہانی نے اسکا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ قاہرہ میں ۵۶۳ھ [؟ ۵۳۳ھ] میں فوت ہوا۔"

(ج) "نمبر ۲۳ ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن الزبیر الاسوانی القاضی، جو قوص اور اس کے نواحی کا ۴۷۲ھ میں قاضی تھا۔ یہ الرشید اور المہذب کا دادا ہے، جن دونوں کا باپ الزبیر تھا۔ النضر نے اس کا مرثیہ لکھا، اس کا کچھ اقتباس ہم آگے ابن النضر کے حالات کے سلسلے میں دیں گے۔"

شیعہ سنی میلانات اور ابن الوقت لوگوں کے طرز عمل پر اس کتاب کے ذیل کے بیانات سے کچھ روشنی پڑے گی:

"نمبر ۲۵۵ عبد القادر بن مہذب بن جعفر الادفوی جو میرا چچا زاد بھائی ہے ..... اسمٰعیلی فرقے سے تعلقات رکھتا ہے، اور النعمان بن محمد کی کتاب دعائم الاسلام کے مطالعے میں لگا ہوا ہے۔" "نمبر ۱۹ ابراہیم بن محمد بن احمد بن نصر المخاطب بہ فخر الدولہ جو الزبیر کے بیٹوں الرشید اور المہذب کا بھانجا تھا، یہ ادیب، شاعر اور انشا پرداز تھا، سب سے پہلے اسی کو صلاح الدین ایوبی نے کاتب مقرر کیا۔ اس کے بعد صلاح الدین کے بھائی الملک العادل کا کاتب بنا، اس نے اپنے ماموں الرشید کے بعض اشعار کی روایت کی ہے۔"

اس بیان سے گمان ہوتا ہے کہ اس خاندان میں شیعہ سنی دونوں میلانات کے لوگ بیک وقت پائے جاتے تھے، کیونکہ سلطان صلاح الدین کا کاتب سنی ہونا چاہیے، ہمارا مولف ادفوی سنی ہے، اور اس کا چچا زاد بھائی اسماعیلی شیعہ۔ (ادفوی کی وفات ۷۴۸ھ میں ہوئی)

خلاصہ | اس کا خلاصہ یہ ہے کہ القاضی الرشید جو اولاً بویہی حکمراں ابو کالیجار کی بیشی میں تھا، ابو کالیجار کی وفات ۴۴۰ھ کے بعد جب بویہیوں کا سقوط ہوا تو وہ مصر چلا آیا، یہاں فاطمیوں نے اس کی قدر دانی کی اور اس کو صعید مصر میں ایک جاگیر عطا کی، ۴۴۴ھ تا ۴۶۳ھ وہ دفتر خارجہ میں رہا، پھر ۴۷۲ھ میں قوص کا قاضی مقرر ہوا، اس کے بیٹے اور پوتے ہی نہیں پڑپوتے تک کے حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں کہ وہ سب مصر میں سرکاری ملازم اور خاصے ممتاز رہے، اس کا مفصل نسب اسی ادفوی نے یہ بیان کیا ہے، "نمبر ۵ ابراہیم بن احمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن فلیتہ بن سعید بن ابراہیم بن حسین القرشی الاسدی ابو اسحاق بن ابو الحسین بن ابو اسحٰق الاسوانی الکاتب۔ یہ الرشید بن الزبیر کا بیٹا تھا ... میں نے اس کی تاریخ ولادت پوچھی تو ۵۱۶ھ معلوم ہوئی، یہ سرکاری دفاتر میں کارگزار تھا۔"

میں ان بیانات سے فی الحال اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ

(۱) کتاب الذخائر والتحف اپنی موجودہ شکل میں الاوحدی کی تالیف ہے، جس نے القاضی الرشید کے مسودے کا جو حصہ بھی دستیاب ہوا اس کو صاف کر کے شائع کیا، اور المقریزی نے اپنی کتاب خطط میں اسی سے استفادہ کیا،

(۲) لیکن اوحدی کا کام صرف مبیضہ کرنا تھا یا تلخیص و انتخاب، اصل کتاب کا نام الہدایا والطرف تھا، اور اوحدی کے اڈیشن کا نام الذخائر والتحف ہوا۔

(۳) کتاب کا نام چونکہ بہت لمبا تھا، اس لیے بعد کے لوگوں نے اس کا طرح طرح کے ناموں میں اختصار کیا،

(۴) چونکہ القاضی الرشید بن القاضی الرشید بن القاضی الرشید تین آدمیوں کا نام ہے، اسی لیے یاقوت کو سہو ہوا، اور اس نے دادا کی کتاب کو اس کے مشہور پوتے کی طرف منسوب کر دیا، یہ بھی ممکن ہے دادا کی تالیف کو پوتے نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو، اور بے خیالی میں ان عبارتوں کی اصلاح نہ کی ہو جہاں دادا نے سال اور تاریخ بیان کر کے ضمیر متکلم کے ساتھ کوئی روایت بیان کی ہے (بالکل اسی طرح جس طرح خلیفہ مامون نے بیت المقدس کے قبۃ الصخرہ میں عبدالملک بن مروان کا نام کتبے میں سے نکال کر اپنا نام تو داخل کرا دیا، لیکن سنہ تعمیر بدلنے کا خیال نہیں کیا، اس لیے اب یہ چوری پکڑ لی گئی،

(۵) دادا القاضی الرشید اگر پانچویں صدی کے آغاز مثلاً ۴۱۰ھ میں پیدا ہوا تو ۴۴۴ھ تک اس کا برسر کار رہنا اور قوص میں قاضی کے فرائض انجام دینا، اور ۴۴۴ھ سے ۴۶۳ھ تک وزارت خارجہ میں رہنا بالکل ممکن ہے،

ممکن ہے آیندہ اہل علم کی کوشش سے مزید حالات معلوم ہو سکیں کہ فوق کل ذی علم علیم!

محبت خاں محبت اور انکا کلام

از جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب

ماہتاب کی روشنی میں تاروں کی ضیا ماند پڑ جاتی ہے، یہی عمل تاریخ ادب اردو میں جاری ہے، جب بھی اپنی شاعری پر ماہتاب ابھر کر آئے، تاروں کی روشنی ماند پڑ گئی، میر و سودا اپنے عہد کے آفتاب ماہتاب تھے، جن کی شہرت و عظمت کے سامنے کتنے ہی شاعر جو ان سے اور فرو تر نہ ہوتے ہوئے بھی داد و ناموری کے متقاضی تھے، دب کر رہ گئے، ہماری تاریخ ادب کی یہ روایت بھی رہی ہے کہ ہم شاعروں کو عموماً ایک ہی پیمانے پر ناپتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر تمام اصناف سخن پر قادر نہیں ہوتا، مگر اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کا مطالعہ ہر صنف سخن کے شاعر کی حیثیت سے کریں، اگر اس نے غزل کے علاوہ قصیدہ بھی لکھا ہے تو ہمیں اس کا مطالعہ قصیدہ نگار کی حیثیت سے بھی کرنا چاہیے، ہم نے میر کی غزل، سودا کے قصائد اور میر حسن کی مثنوی پر تمام زور قلم صرف کر دیا، لیکن میر کی مثنویات، سودا اور میر حسن کی غزلیات کی طرف کم توجہ کی، کیونکہ سودا اور میر حسن کی غزلیات میر کی غزلوں کے پایہ کی نہیں تھیں، اسی طرح میر کی مثنویات میر حسن سے کمتر تھیں، اور سودا کے قصائد کے سامنے میر و میر حسن کے قصائد بالکل پھیکے نظر آتے تھے، اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو ادب کا ایک وسط درجہ کا طالب علم میر کو غزل گو، سودا کو قصیدہ نگار اور میر حسن کو مثنوی نگار کی حیثیت سے جانتا ہے، اس سے اگر میر کی مثنویات، سودا و میر حسن کی غزلیات پر سوال کیا جائے تو جواب دینے میں اس کو بڑی دشواری پیش آئے گی،

اس میں شک نہیں کہ میر تقی میر بزم غزل گوئی کے صدر نشین تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی

شک و شبہہ سے بالاتر ہے، کہ اس کے عہد کے چند شعراء میرؔ کے ہم رتبہ نہ ہوتے ہوئے بھی انکے بزم نشینوں میں ہیں، اور فرق مراتب کے پیش نظر ان کا شمار صف دوم کے شعرا میں کیا جا سکتا ہے، چنانچہ خواجہ حسنؔ، میر حسنؔ سوزؔ حسرتؔ اور محبتؔ اسی صف میں ہیں، ان میں محبت خاں محبت غزلگو بھی تھے اور مثنوی نگار بھی، فارسی، عربی اور پشتو میں بھی کہتے تھے، انھوں نے فارسی کا ایک لغت اور ایک آمد نامہ بھی لکھا تھا، مربی سخن بھی تھے، چنانچہ خواجہ حسنؔ، جعفر علی حسرتؔ اور قلندر بخش جرأتؔ ان کے دامن دولت سے وابستہ رہے، انھیں موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی، انکے کئی ہمعصر موسیقار ان کی سرکار سے تنخواہیں پاتے تھے، صاحب سیف بھی تھے، انھوں نے جنگ روہیلہ (۲۳ر اپریل ۱۷۷۴ء) میں داد شجاعت دی تھی۔

اس مضمون میں اس جامع صفات شخصیت کی حیات اور شاعری پر تلاش و جستجو سے ممکن مواد فراہم کیا گیا ہے، تاکہ تاریخ ادب اردو میں اس کی جائز حیثیت متعین ہو سکے۔

مظفر الدولہ شہباز جنگ نواب محبت خاں محبتؔ، نواب حافظ رحمت خاں (۱۷۰۸ء تا ۱۷۷۴ء) والی روہیل کھنڈ (۱۷۴۹ء تا ۱۷۷۴ء) کے صاحبزادے تھے، ان کی پیدائش ۱۷۵۰ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم حسب رواج علماء کی نگرانی میں پائی، مادری زبان پشتو اور فارسی تھی، اردو لشکری اور عوامی زبان تھی، اس میں انھیں فطرۃً مہارت حاصل ہوئی عربی پر پوری قدرت حاصل تھی، اس میں شعر کہتے تھے، فنون سپہ گری میں پٹھانوں کی روایات کے مطابق کمال حاصل تھا، ان کی شادی تحصیل فرید پور ضلع بریلی میں عبد الستار خاں کمال زائی کی صاحبزادی سے ہوئی، یہ شادی روہیلوں کے مختصر دور حکومت کا ایک یادگار واقعہ ہے، میر عوض علی مدعاؔ شاہجہاں آبادی نے شادی پر تہنیت کا قصیدہ گزرا جس کے چند شعر یہ ہیں[۱]:-

[۱] تذکرۂ شعرائے اردو۔ میر حسن، ص ۱۷۳

ماہ نے کھولدیا ہے کفِ سیمیں اپنا
دوسرا ہاتھ جو پایا تو بجایا دستک

نشۂ عیش سے ہر سرو ہوا تنک سر شار
کہ لیا چاہے ہو غنچہ کے نمک دان سے گزک

حسن کے خلوتیاں بزم حنا بندی ہیں
شعلے سے باندھیں ہیں پروانے کے باؤں پہ کفک

محفل عیش میں بلبل نے بجائی شہنا
گوشۂ باغ میں غنچے نے اٹھائی ڈھولک

قلقل شیشہ یہ کہتا ہے کہ مت بیٹھ خموش
جام ہالے ہے صف بادہ کشاں پر چشمک

ساقی شوخ کہے ہے کہ غنیمت ہے وقت
ساغر عمر تو لبریز ہے مت جائے چھلک

شیخ اگر کچھ بھی ہے غیرت کی ترے دل میں ترنگ
ساغر و شیشہ اٹھا سبحہ و سجادہ پٹک

جشن نواب فلک رتبہ محبت خاں ہے
جس کی شادی میں ہیں سب جمع بزرگ و کوچک

نخلے زادوں کو جو دیکھو تو بہنگام سرود
مچ رہا ہے یہی غل رعشۂ ہلکت ہلکت

نواب صاحب کی بیشتر اولادیں سخن فہم و سخن سنج تھیں، صاحبزادوں میں محمد منصور خاں مہرؔ، شاہ عالم خاں عالمؔ، محمد مقیم خاں مقیمؔ، پوتوں میں محمد حسین خاں ضیاءؔ، احمد حسن خاں جوشؔ اور محمد سلیمان خاں اسدؔ، پرپوتوں میں عابد علی خاں خورشیدؔ، اور محمد علی خاں قمرؔ، نواسوں میں عبد العزیز خاں عزیزؔ اچھے شاعر گذرے ہیں[۱]،

محبت خاں نہایت وجیہ و شکیل تھے، غلام حسین مولف سیر المتاخرین رقمطراز ہیں[۲]:

"میں نے آصف الدولہ کے آغاز حکومت میں حافظ رحمت اللہ خاں اور دوندے خاں کی اولاد کو اکثر لکھنؤ میں دیکھا، اور ان کی کیفیت خود مشاہدہ کی، اس جماعت میں سب سے بہتر محبت خاں ابن حافظ رحمت اللہ خاں ہے، جو عنایت خاں کا چھوٹا بھائی ہے، یہ شخص صورت و سیرت دونوں کے اعتبار سے حکومت اور سرداری کی لیاقت رکھتا ہے۔"

[۱] حیات حافظ رحمت خاں از الطاف علی، ص ۳۱۹ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں [۲] بحوالہ حیات حافظ رحمت خاں، ص ۳۱۸

۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو جنگ روہیلہ ہوئی، اور نواب شجاع الدولہ اپنے حلیف انگریزوں کی مدد سے فتحیاب ہوئے، نواب حافظ رحمت خاں جنگ میں کام آئے، اور روہیلکھنڈ کی نوابی ختم ہو گئی، روہیلوں پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، الطاف علی خاں نے لکھا ہے:[1]

"شجاع الدولہ نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا، اور نواب دوندے خاں مرحوم کے دار الحکومت بسولی کی طرف روانہ ہوئے، لشکر کے ہمراہ محبت خاں اور ان کے بھائیوں کے علاوہ حافظ الملک مرحوم کی اہلیہ محترمہ، نواب عنایت خاں مرحوم کی بیوہ اور دوسری بیگمات اور بچوں کو بھی رشیدی بشیر نے کشاں کشاں سخت بے حرمتی اور رسوائی کے ساتھ پیدل اور بار برداری کے چھکڑوں پر سوار کر کے اپنے ساتھ لے لیا، مئی کا مہینہ جو روہیلکھنڈ میں سخت گرمی اور دھوپ کا زمانہ ہوتا ہے، شروع ہو گیا تھا، اور ان نازپروردوں کو بیسیوں کوس چٹیل میدانوں میں اسی دھوپ اور لو میں پیدل یا چھکڑے پر تمام تمام دن سفر کرایا جاتا، تمام قیدی ایک دوسرے سے رسیوں میں بندھے ہوئے تھے، جسموں پر میلے کپڑے نہایت کثیف اور بوسیدہ ہو گئے تھے، کئی کئی دن بھوکے اور پیاسے رکھے جاتے اور کوئی نہ پوچھتا کہ تم نے کیا کھایا اور کیا پیا۔"

اس کے بعد نواب محبت خاں مع افراد خاندان قلعۂ الہ آباد میں قید ہوئے، کچھ دنوں کے بعد رہا ہو کر شجاع الدولہ کے لشکر کے ہمراہ فیض آباد میں رہے، نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ کے دور وزارت میں، انگریزوں کی مداخلت پر روہیلے قلعۂ الہ آباد سے رہا کر کے لکھنؤ لائے گئے، جہاں ان کے وظائف مقرر ہوئے، نواب محبت خاں کو سترہ ہزار ایک سو کتیس روپیہ چند آنے وجہ مقررہ سے اور دس روپیہ یومیہ ریذیڈنٹ لکھنؤ کے خزانے سے

[1] حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۳۹

ملتے تھے، آٹھ ہزار چھ سو چھیالیس روپیہ سالانہ حافظ الملک کے سرداروں کا بھی وظیفہ ان کے اختیار و تصرف میں تھا،[1] اس سے محبت خاں کے مصائب کا دور ختم ہو گیا، اور وہ لکھنؤ میں بافراغت زندگی بسر کرنے لگے، نواب آصف الدولہ ان کے ساتھ ہمیشہ لطف و عنایت کا برتاؤ کرتے تھے،

محبت خاں محبت کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) عربی، فارسی، پشتو اور اردو شاعری پر مشتمل ایک دیوان (۲) مثنوی اسرار محبت
(۳) لغت (۴) فارسی آمد نامہ

ان میں آخر الذکر دو کتابیں نہیں ملتیں، ممکن ہے تلف ہو گئی ہوں، مثنوی کے قلمی اور مطبوعہ نسخے ملتے ہیں، مکمل دیوان کا نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے، مجھے صرف اردو غزلیات پر مشتمل دیوان کا نسخہ مل سکا جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے (مخطوطہ نمبر ۲۱۰۹ الف۔ نظم اردو)

محبت خاں محبت کے تغزل اور مثنوی کا تعارف پیش کرنے سے پہلے، ان کے تلمذ کے متعلق گفتگو کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ تذکرہ نگاروں کا اس بارہ میں اختلاف ہے، میر حسن نے لکھا کہ محبت خاں محبت، خواجہ حسن یا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے (تذکرۂ شعرائے اردو) مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں، رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں، اور مولانا عبد السلام ندوی نے شعر الہند، ج ۲ میں انھیں جعفر علی حسرت کا شاگرد بتایا ہے، عبد الغفور نساخ (سخن شعرا) سید نور الحسن خاں (طور کلیم) اور سید علی حسن خاں (بزم سخن) نے لکھا ہے کہ وہ خواجہ میر درد اور جعفر علی حسرت سے اصلاح لیتے تھے، سید محسن علی محسن (سراپائے سخن) کی رائے ہے کہ وہ ابتدا میں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے، ان کے انتقال کے بعد جرأت سے رجوع کیا، الطاف علی

[1] حیات حافظ رحمت خاں ص ۳۱۳

نے حیات حافظ رحمت خاں میں انھیں صرف جرأت کا شاگرد بتایا ہے، ان آرا کو یکجائی طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر تذکرہ نگاروں کا اجماع جعفر علی حسرت سے تلمذ پر ہے اور ہمارے خیال میں یہی صحیح ہے۔

کیا محبت خاں خواجہ حسن کے شاگرد تھے؟ اس سلسلہ میں خود میر حسن جنھوں نے خواجہ حسن کا ذکر کیا ہے، مشتبہ ہیں، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے: "باصلاح خواجہ حسن یا میاں حسرت جرأت نمودہ"۔ میر حسن کے تذکرہ کی تکمیل ۱۱۸۸ھ – ۱۱۹۲ھ – مطابق ۱۷۷۴ء – ۱۷۷۸ء میں ہوئی، جو محبت کے ورود لکھنؤ کا نیا زمانہ تھا، اس لیے وہ یقین کے ساتھ نہیں لکھ سکے کہ خواجہ حسن کے شاگرد تھے یا جعفر علی حسرت کے، جہاں تک خواجہ حسن کا تعلق ہے، وہ اور ان کے بھائی خواجہ حسین مصنف سیر المتاخرین چشتی مودودی درویش ہونے کی وجہ سے امرائے روہیلہ میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے، روہیلکھنڈ کی نوابی ختم ہونے کے بعد خواجہ حسن اور محبت لکھنؤ میں یکجا ہوئے اور دونوں نے جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی، ان حالات کی روشنی میں یہ تو قرین قیاس ہے کہ جوان العمر محبت خاں اور خواجہ حسن میں مشورۂ سخن ہوتا ہو لیکن یہ تصور کہ محبت نے خواجہ حسن سے اصلاح لی ہو، قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا، دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد ہوئے، اور اگر استادی و شاگردی کا فرق مراتب درمیان میں ہوتا تو خواجہ حسن اولاً تو کسی کے شاگرد ہوتے ہی نہیں، اور ہوتے بھی تو حسرت کے ہرگز نہیں، میرے خیال میں اس محبت و مودت کی بنا پر جو محبت خاں کو خواجہ حسن سے تھی، میر حسن کو یہ گمان ہوا کہ وہ خواجہ حسن سے اصلاح لیتے ہیں، در اصل اس محبت اور توقیر کا سبب خواجہ حسن کی سیادت زیادہ اور شاعری کم معلوم ہوتی ہے، میر حسن کی تائید دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی نہیں کی ہے،

میر درد کا انتقال ۱۱۹۹ھ مطابق ۸۵-۱۷۸۴ء میں ہوا،[1] لکھنؤ پہنچ کر محبت خاں جعفر علی

[1] میر درد کی تاریخ وفات میں میں نے رام بابو سکسینہ کی رائے کو ترجیح دی ہے، دیکھئے تاریخ ادب اردو ص ۱۲۳

حسرت کے شاگرد ہوئے، حسرت کا انتقال ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں ہوا،[1] لہذا ۱۷۷۴ء – ۱۷۷۵ء جو محبت خاں کے لکھنؤ پہنچنے اور حسرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا زمانہ ہے، اس وقت سے حسرت کے انتقال کے وقت تک ان کا میر درد سے مشورۂ سخن کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، ایک ہی وقت میں کوئی شاعر باضابطہ طور پر دو استاذوں کا شاگرد نہیں ہوتا اور نہ کوئی استاد اس بات کو پسند کر سکتا ہے، جنگ روہیلہ (۱۷۷۴ء) سے پہلے محبت خاں کو خواجہ حسن کی رفاقت میسر تھی، اس کے باوجود اگر وہ باضابطہ طور پر کسی کے شاگرد ہوتے تو کسی ایسے شاعر کو تلاش کرتے جو ان کے قریب ہوتا، اس وقت بریلی اور اس کے مضافات میں محمد قیام الدین قائم، غلام ہمدانی مصحفی، حکیم کبیر سنبھلی، فدوی لاہوری، محمد نعیم نعیم میر عوض علی مدعا، اور پروانہ علی شاہ پروانہ مرادآبادی موجود تھے، محبت خاں ان میں سے کسی کے شاگرد نہیں ہوئے، ان اساتذہ کی موجودگی میں جو ان کے بزرگوں کے نمکخوار اور ان کے بالکل قریب تھے، ان کا میر درد کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا،

جرأت، محبت خاں کی طرح جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے، اس لیے حسرت کے انتقال کے بعد محبت کا جرأت سے مشورۂ سخن کرنا مضحکہ خیز امر ہے، محبت خاں کے لکھنؤ آنے اور حسرت کی وفات تک کا زمانہ اکیس[2] سال کا ہے، یعنی محبت خاں نے بیس اکیس سال حسرت سے کسب فیض کیا، محبت جیسے جامع العلوم انسان کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ وہ حسرت کی وفات کے بعد بھی محتاج اصلاح تھے، خلاف قیاس ہے، یہاں محبت کا ایک شعر نقل کرنا بے محل نہیں ہوگا،

شاعران حال کو دیکھا سوا استاد کے
اب محبت ہے سخن پر ایک سر تیرا بلند

[1] حسرت کی تاریخ وفات کے سلسلے میں میں نے مرزا علی لطف کی رائے کو صائب مانا ہے، دیکھئے گلشن ہند، ص ۱۰۷

اس شعر کا مفہوم تو یہی ہے کہ وہ جعفر علی حسرت کے بعد اپنے کو بھی ذی حیثیت سمجھتے تھے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت کی وفات کے بعد انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر شاعر کسی سرکار میں ملازم ہو تو اس کا نواب کا استاد ہونا بھی لازمی ہے، محبت خاں کے بڑے بھائی نواب عنایت خاں جنگ پانی پت (۱۱۷۴ھ ۱۷۶۱ء) کے آزمودہ سپاہی تھے، ان کو شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، لیکن میر عوض علی مدعا سو روپے ماہانہ پر ان کی سرکار میں ملازم تھے[1]، اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا جا سکتا کہ عنایت خاں، مدعا کے شاگرد تھے، اس لیے ہمارے خیال میں الطاف علی صاحب کا یہ لکھنا کہ محبت خاں، جرأت کے شاگرد تھے، اور ثبوت میں یہ شعر پیش کرنا ؎

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے بستان کے
نوکر ہوئے بھی ہم تو محبت خاں کے

کوئی ثبوت نہیں ہے، جرأت از راہ پرورش محبت خاں کی سرکار میں ملازم تھے، وہ بھی استاد بھائی ہونے کی وجہ سے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے،

دیوانِ محبت کے قلمی نسخے میں محبت کا تخلص سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے، یہی التزام دو ایک جگہ حسرت کے نام کے ساتھ ہے، محمد یار خاں امیر اور درد کا تخلص بھی بعض اشعار میں آیا ہے، لیکن اس کو سرخ روشنائی سے نہیں لکھا گیا ہے، اس سے بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ محبت کو حسرت کے ساتھ شاگردی کی بنا پر ایک خاص خصوصیت تھی، یہ بھی اس کی ایک قوی شہادت ہے کہ محبت، درد کے شاگرد نہیں تھے اور انھیں صرف جعفر علی حسرت سے تلمذ حاصل تھا۔

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ محبت اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ حسن سے باہمی صلاح کے طور پر مشورہ سخن کرتے رہے جس کا تعلق شاگردی و استادی

[1] تذکرۂ شعرائے اردو میر حسن ص ۱۷۲

کے ضابطوں سے نہیں تھا، ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء میں جب وہ لکھنؤ آئے تو انھوں نے جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی۔ حسرت کے انتقال کے بعد اپنی فکر کو رہنما بنایا، اور کسی استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا، اس طرح اول و آخر وہ صرف جعفر علی حسرت ہی سے وابستہ رہے، اور انھیں خواجہ حسن، درد اور جرأت کا شاگرد بتانا صحیح نہیں ہے۔

محبت خاں محبت کے دیوان مخطوطہ رامپور کے اوراق کی تعداد ایک سو دس ہے، یعنی دو سو بیس صفحات ہیں، ہر صفحے پر اوسطاً دو غزلیں ہیں، دیوان میں نہ تمہید ہے نہ ترقیمہ۔ البتہ ابتدائی صفحہ پر ایک نوٹ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کتب خانہ رامپور میں ۹ جون ۱۹۰۶ء میں آیا، کاغذ دبیز اور قدیم ہے، غزلیں صاف اور خوشخط لکھی گئی ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ دیوان محبت خاں کی زندگی میں نہیں، لیکن اس کے کچھ ہی عرصے بعد لکھا گیا ہے، کیونکہ انداز تحریر قدیم ہے، محبت کے کلام میں خیالات کی سادگی اور بحروں کی شگفتگی اور ترنم نمایاں ہے، قافیہ و ردیف کا ربط استادانہ ہے، جو جعفر علی حسرت کا فیض معلوم ہوتا ہے،

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں جو محبت خاں کی شاعری کا دور ہے اردو زبان ادبی و لسانی اعتبار سے راہ ترقی پر گامزن تھی، اردو زبان میں فارسی اور عربی الفاظ کا اضافہ ہو رہا تھا، یہ دور "دکھنی" اور "ہندی" کا ناسخ تو نہیں لیکن فارسی و عربی لغات کے اضافے اور ان کے صحت کے ساتھ استعمال کا زمانہ ضرور ہے، اس وقت تک اردو شاعری میں بھاشا کی نرماہٹ باقی تھی، اور فارسی خیالات اور الفاظ کے استعمال سے اثرات شعری دو آتشہ ہو گئے تھے، غزل میں خیال کی سادگی، جذبات کی گرمی، بیان کی اثر انگیزی تھی، اس کے ایک چوتھائی صدی گزرنے کے بعد ہی لکھنؤ کے شعرا کے یہاں نامانوس اور مشکل فارسی و عربی الفاظ

دور از کار تشبیہات و استعارات، مبالغہ آرائی، ژولیدہ خیالی اور صناعی کی وجہ سے غزل کی روح ختم ہو گئی اور متروک و غیر متروک، فصیح و غیر فصیح کی بحثوں میں فارسی و عربی کا اسقدر غلبہ ہوا، کہ اصل تحریک غیر فطری بن گئی، اس دور کے شاعر الفاظ کے جوہری تو تھے، مگر جواہر کے سحر کا راز ان پر منکشف نہیں ہوا، اس تحریک کے مظاہر مصحفیؔ کی شاعری میں مل جاتے ہیں، محبت خاں کا تعلق اس تحریک کے فطری دور سے تھا، اور وہ قائمؔ، میرؔ، میر حسنؔ وغیرہ کی طرح الفاظ کے فطری اثرات پر نظر رکھتے تھے، انھوں نے بھی فارسی سے استفادہ کیا ہے، مگر ایک خاص تناسب سے، اس اعتبار سے محبت خاں محبتؔ کی شاعری خاصی اہم ہے، اسکے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:۔

نظر کے پڑتے ہی تجھ پر مرا گلہ نہ رہا
کہ دیکھتے ہی تجھے دل میں مدعا نہ رہا

یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا
تھا مرا ہمدرد لیکن مجھکو سمجھانے لگا

تمنا یار سے ہیہات کہنے میں نہیں آتی
غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

ساقی ہمیں گھٹا جو بہ مستی نظر پڑی
یاد آئی مے وہیں وہیں مستی نظر پڑی

دید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں
اڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانہ میں

دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا تک
مرا غبار کیجیو برباد اس طرح کا

دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھکو کیا
اس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھکو کیا

منزل اول ہے ابھی عشق کی لے تاب و تواں
چھوڑ جاتے ہو تم افسوس مجھکو کیا

گالی کا انتظار تو حد سے گزر چکا
منہ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی

دامن جھٹک جھٹک نہ گزر اس گلی سے تو
آخر کو تیری راہ کا میں ایک غبار ہوں

تعلیم کس نے کی ہے یہ بیداد زلف کو
زنجیر اپنا کہتی ہے استاد زلف کو

ہوا سرداد پر منصور کے ہوتے سے یہ ظاہر
کہ بعد از مرگ بھی عاشق کی سر داری نہیں جاتی

ایک تو زلف کے پھندے میں پھنسا تھا یہ دل
تس پہ یہ خط اور ہوا دام خدا خیر کرے

جی دھڑکتا تھا مرا آگے جن باتوں سے
لایا قاصد وہی پیغام خدا خیر کرے

توبہ کل اس عشق سے اس دل نے تو کی تھی پر آج
پھر محبت کا لیا نام خدا خیر کرے

دل ہے تو آشنا کس کا
عقل کا یا جنون کا کس کا

فائدہ کیا ہے نالہ کرنے سے
حال سنتا ہے بے وفا کس کا

دل جگر دونوں اس نے قتل کیے
دے محبت کو خوں بہا کس کا

فردائے قیامت کے تب آنے کی تھی امید
جب ہم سے ترا وعدۂ فردا نہ ہوا تھا

کچھ شور سا ہے دل کی خبر لیجیو ہمدم
ابتک کبھی اس کوچے میں غوغا نہوا تھا

مجھ پر ہی زباں تیری کھلی ہے نہیں مجھ سے
سرزد کبھی اک حرف بھی بیجا نہوا تھا

کل راہ میں گھیرا ہے تو گھبرا کے وہ بولے
ہاں ڈھب نہیں کیجیگا ملاقات کہیں اور

پاکبازی پہ مری شک ہے تو دیتے جاؤ
بوسہ ہر بار مجھے یار قسم لے لیکر

جی میں ہے دل کو سرخرو کیجئے
تیغ قاتل کے روبرو کیجے

نالہ اپنا اثر نہیں کرتا
فائدہ کیا جو ہائے ہو کیجے

دیر و کعبہ میں تو نہیں ملتا
کس جگہ تیری جستجو کیجے

بات اپنی تو وہ نہیں سنتا
اس سے کیا ہائے گفتگو کیجے

خون میرا اٹھا لے دامن سے
جائے کیا لاکھ شست و شو کیجے

وے جو دعوی عشق کرتے ہیں
لا کے اب مجھ سے دوبدو کیجے

جو کہ ثابت رہے محبت میں
اے میاں اس کی آبرو کیجئے

اس چشم تر کو میری گہربار کر چلے
یہ اشک پھر گلے کا مرے ہار کر چلے

انداز و ناز و عشوہ میں کیا کیا بیاں کروں
اس دل کو سو جگہ پہ گرفتار کر چلے

کیا سحر تھا کہ باغ میں خوش چشم آن کر
نرگس کو اک نگاہ میں بیمار کر چلے

ہشیار رہیو دل تو شب تار زلف میں
رہزن بہت ہیں ہم تجھے بیدار کر چلے

کیا بات تھی نہ جانیں کہ وہ لب ہلا کے یاں
دونوں جہاں سے اب ہمیں بیزار کر چلے

ہم کو چلے نہ رہتی محبت میں چھوڑ حیف
دنیا میں تھا یہی کہ جو تم پیار کر چلے

دین و ایمان و خرد تو لے چکے ہیں ہم سے آپ
باقی اب جاں ہے اسے لیجائیے یوں ہی سہی

اب تلک دنیا میں کیا کیا نعمتیں کھاتے رہے
عشق میں اب تیرے غم کو کھائیے یوں ہی سہی

پیام آمد کا یہ کس کی صبا کے ساتھ آتا ہے
کہ گل آپ ہی کھلا جاتا ہے غنچہ مسکراتا ہے

میسر وصل ہو جب کو وہ اس لذت کو کیا جانے
مرا دل فرقتوں میں آہ جو جو حظ اٹھاتا ہے

دل اس شوخ کو دئے ہی بنی
اور عوض اس کے غم لیے ہی بنی

جس گھڑی تو لگائے تیر نگاہ
سینا اپنا ہدف کیے ہی بنی

میرے لاشے پہ تو مسیحا دم
اگر آوے مجھے جئے ہی بنے

چاک ہے جیب ناصح آپہنچا
اب محبت مجھے سئے ہی بنے

اس سادہ، شگفتہ اور غنائی فضا میں درد کی ٹیسوں، غم کی تپش، کرب والم کے جرکول اور مایوسی و محرومی کے احول کا شبہہ تک نہیں ہوتا، لیکن اشعار میں محبت خاں کی شخصیت کا سونا گھل کر جھلکتا ہے،

اس غم کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟ ذہنی لذت، میر تقی میر کی شاعری کے اثرات، عشق یا کسی مقصد میں ناکامی اور احساس محرومی، ہمارے سامنے ان کی زندگی کے حالات ہیں، نوجوانی میں ان کی شادی ہوئی، وہ کثیر العیال تھے، وہ ایک سال چھوڑ کر عمر کا تمام حصہ

عیش و عشرت میں گزرا، شہرت، عزت اور ثروت نے قدم چومے، اس لیے بظاہر انکی زندگی شاد و بامراد تھی، لیکن ان کے کلام کی یاس و حرمان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زخم خوردہ دل کی صدا ہیں ؎

روتے دیکھا مجھے تو دشمن کا
دیدۂ بے اختیار بہہ آیا

ہر چند کہ رُئے ہم محبت
پر دل کا غبار کچھ نہ نکلا

دل تو اک مدت ہوئی جاتا رہا سینے سے
جان بھی جاتی ہے اب میری خدا خیر کرے

ایک زندہ ہوں میں درد محبت سے وگرنہ
یہ درد کہ شند اتھا مسیحا نہوا تھا

جیوں عشق میں تغیر ہوئی ہے میری حالت
ایسا تو بد احوال کسی کا نہوا تھا

سن سن کے بیقرار محبت ہوئے سبھی
بس درد کے بڑھے گا تو اشعار کب تلک

آمد آمد ہے اب درد کی رخصت ہو چلے
صبر اور طاقت و آرام خدا خیر کرے

سرخی اشک کبھی اور کبھی زردی رو
تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھکو

اور کیا جانوں بجز حرف محبت ناصح
یہی استاد ازل نے ہے پڑھایا مجھکو

محبت آبلۂ پا کو ہوئی ہے اب کے پھر وحشت
یہ مژدہ جا کے پہنچا دو کوئی خار بیاباں کو

ہو کباب جگر اور سینے کی بریانی ہو
ہو سکے عشق کی اے دل تو یہ مہمانی ہو

روشن ہیں مرے جسم کے سب داغ جیوں چراغ
وقت نظارہ ہے کہ سراپا بہار ہوں

کیا کہیں پہچاننے سے آشنا سب رہ گئے
ہم نے دیکھا یاں تلک آزار دل کے ہاتھ سے

جوش مارے ہے ہر ایک دم خون دل کا کیا کروں
ہیں مری آنکھیں سدا خونبار دل کے ہاتھ سے

گاہ رونا شغل ہے میرا کبھی آہ و فغاں
یں کبھی رہتا نہیں بیکار دل کے ہاتھ سے

اے فلک پیدا کیا تو نے غم میرے لیے
راحت اوروں کے لیے درد والم میرے لئے

دیکھ تو اتنا کوئی غمگین ہے تیرے دور میں
جام مے اوروں کو ہے اور جام سم میرے لیے

کیا کرے کوئی لکھا قسمت کا کب تبدیل ہو
رنج ہی گر کیے رقم لوح و قلم میرے لیے

اگرچہ لالہ ترے دل میں داغ ہیں لیکن
ابھی تو لینی ہے تعلیم میرے سینے سے

محبت خاں کی زندگی کے دو سال (۱۱۷۴ھ/۱۷۷۵ء) کے حالات ایک غیور پٹھان اور ایک والی ملک کے اعصاب منتشر کرنے کے لیے کافی تھے. جنگ روہیلہ میں ناکامی، ایک اولو العزم باپ کی وفات، جنگ کے بعد روہیلوں کا استیصال، اہل خاندان کی کسمپرسی اور بے توقیری ایسے حالات ہیں جو ایک ذہین و ذکی الحس انسان کا نظام فکر بدلنے کے لیے کافی ہیں، لکھنؤ میں اقامت اختیار کرنے کے بعد گو انھیں عزت و آرام میسر ہوا لیکن زخم مندمل نہ ہو سکا. اور غریب الوطنی اور عظمت رفتہ کے احساس سے ان کا دل برابر غمگین رہا، ان کا یہ شعر اسی نوعیت کا ہے،

صیاد گر ز باغ جدا گشتہ ام چہ غم
از خون خود قفس شدہ رشک چمن مرا

اہل طریقت کی بات زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہے، اور شاعری میں اسی کلام میں تاثیر ہوتی ہے جس میں زبان سے زیادہ دل کو دخل ہوتا ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود شاعر کا دل کسی جذبے سے متاثر ہو، محبت خاں نے غم جاناں اور غم حیات کو خون دل میں تحلیل کر کے اشعار کہے ہیں، اس لیے ان کے کلام میں سوز و اثر ہے۔

پڑھ محبت کی غزل اے دل کہ کٹ جائے سفر
دردمندوں کو یہی ہے نغمہ و آہنگ راہ

سید الطاف علی مولف حیات حافظ رحمت خاں نے محبت کے دو عربی اور اکتالیس فارسی اشعار درج کیے ہیں، ہم اس سے انکے فارسی کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں،[1]

[1] ص ۳۱۴ - ۳۱۵

زہر گذشت محبت زہر کہ پرسیدم
بہ عارض اشک پیاپے چکید و ہیچ نگفت

رویم ببیں شگفتہ کہ در عین خرمی
چوں گل ہزار چاک شود پیرہن مرا

صیاد گر ز باغ جدا گشتہ ام چہ غم
از خون خود قفس شدہ رشک چمن مرا

قاصد از شہد و شکر بہ سخنے می گوید
زاں کہ حرف از لب شیریں دہنے می گوید

دلم از سینۂ پر داغ حدیثے دارد
بلبلے حرف بہار چمنے می گوید

گل فشاں آمدہ ہر وقت محبت بہ کلام
زانکہ ہر دم سخن گلبدنے می گوید

از تپ خورشید محشر فارغم
بر سر من سایۂ دیوار تست

عزیزم دار و آں یوسف کہ گوید
کسے شاید کہ خوابے دیدہ باشد

چشمم اے ماہ شب و روز زبس گریان است
خلق گویند کہ امسال عجب باران است

درد محبت تو مرا آہ نہ دانی صادق
باوجود یکہ مرا نام محبت خان است

دل ز خود رفتہ براہ طلبت برخاست
باز نہ نشست دمے تا کہ ز دنیا برخاست

چوں تو برخاستی از بہر علاج جاناں
شور افتاد بہ عالم کہ مسیحا برخاست

بسکہ گردید فزوں گرمی و اشک و آہم
آب شد آتش و دود از دل دریا برخاست

یار موجود در آغوش نمی بیند کس
اے محبت ز جہاں دیدۂ بینا برخاست

(باقی)

شعر الہند حصہ دوم

اس میں اردو شاعری کے تمام اوصاف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔

اثار علمیہ و تاریخیہ

مکاتیب مولانا احمد سعید صاحب دہلوی

بنام

بنام مولانا سید سلیمان ندوی

مورخہ ۱۸ شوال المکرم ۱۳۴۴ھ
دہلی

سیدی و مولائی دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، دفتر میں مولانا سجاد صاحب کا ایک خط موصول ہوا ہے جس کا ضروری اقتباس مولانا کی حسب ہدایت آپ کے پاس بھیج رہا ہوں،

نمبر ۱۔ الموتمر العالم الاسلامی قائم کیجائے جس کے مقاصد و نصب العین حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) حکومت حجاز کو قوی تر بنانے کی سعی کرنی،

(ب) غیر مسلمین کے وسائس دائرے سے ارض حجاز و جزیرۃ العرب کو پاک رکھنے کی کوشش کرنی،

(ج) دنیائے اسلام کے مرکز توحید (ارض حجاز) کی طرف مسلمانان عالم کو ہمیشہ متوجہ رکھنا،

(د) دنیائے اسلام کے ساتھ روابط قائم کرنا اور اس کو مستحکم بنانا،

نمبر ۲۔ آیندہ موتمر حجاز میں مندوبین حجاز و مندوبین عالم اسلامی سے انتخاب کرکے موتمر عالم اسلامی کی بنیاد قائم کردیجائے، اور جن ممالک سے مندوبین نہ آئے ہوں ان ممالک کے ارکان کی تعداد متعین کرکے ان کو اطلاع دیجائے۔

نمبر ۳۔ اس موتمر میں الموتمر العالم الاسلامی کے لیے ایک مختصر دستور العمل طیار کیا جائے جس میں یہ دو دفعات بھی ضرور ہوں، اوّل یہ کہ ہر سال موتمر حجاز کا سالانہ اجلاس ارض حجاز میں ہوا کرے گا، دوم یہ کہ اس موتمر کا صدر دفتر مکہ معظمہ میں رہے گا،

نمبر ۴۔ اسی موتمر میں لجنۃ العالم الاسلامی المستشاریہ للحکومت الحجاز کی تشکیل ہوتی چاہیے، جس کے اعضا کم از کم سات ہوں، جو مندوبین عالم اسلامی سے منتخب کیے جائیں، اس لجنہ کے تمام اعضا کا قیام ایام رکنیت تک ارض حجاز میں لازم ہوگا، یہ مجلس حکومت حجاز کو مفید مشورے دیتی رہے گی، اس مجلس کے اخراجات ان ممالک کے ذمہ ہونگے جن کے نمایندے اس مجلس کے رکن ہوں گے۔

نمبر ۵۔ اس موتمر میں یہ بھی طے کرلیا جائے کہ چونکہ حکومت حجاز خالص حکومت اسلامی ہے اور ہمیشہ خالص اسلامی حکومت رہے گی، اس لیے اس حکومت کی تشکیل اور اس کے اصول و قوانین شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوں گے اور حاکم حجاز کے تعین و انتخاب میں نسل و وراثت کو دخل نہ ہوگا، اور حاکم حجاز کا انتخاب اگرچہ حجاز کے ارباب حل وعقد کے انتخاب سے عمل میں آئے لیکن اصول طریقہ انتخاب و قوانین عزل و نصب ایسے وضع کیے جائیں گے جو شریعت اسلامیہ سے ماخوذ اور اس میں موجود ہوں، یا کم از کم مخالف شرع نہ ہوں، اور ان اصول کی ترتیب و وضع میں اہل حجاز کے ساتھ مندوبین عالم برابر کے شریک ہوں گے،

میرے خیال میں اس وقت اگر یہ سب باتیں طے ہوجائیں تو بہت بڑی کامیابی اور اس سے آیندہ کامیابیوں کے لیے راہ کھل جائے گی اور امید کی جاتی ہے کہ علما سے خوش آیند توقعات آگے چل کر پورے ہوں گے اور رفتہ رفتہ اس اصول سے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ حکومت حجاز کے اندر مسلمانان عالم کا اثر سرایت کرے گا، اور ابن سعود وغیرہ سے جو خطرات ہیں ان کا بھی سد باب ہوجائے گا، اور اس طریق کار سے مجلس دول اسلامیہ کی بنیاد قائم ہوجائے گی، اور

اور بہت ممکن کہ صحیح معنوں میں خلافت اسلامیہ کے قائم کرنے کا موقع مل جائے۔ اور اگر اس وقت حجاز میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کی گئی یا یہ کہ موجودہ حاکم کے انتخاب کو غلط بتا کر انتخاب جدید کا مطالبہ کیا گیا یا یہ کہ حکومت حجاز کی تشکیل میں کسی قسم کے تغیر کی خواہش ظاہر کی گئی تو اغلب قرینہ یہ ہے کہ سلطان ابن سعود ہرگز ان امور سے متفق نہ ہوں گے اور موجودہ احوال میں عموماً اہل حجاز بھی ابن سعود کے منشا کے خلاف رائے نہ دے سکیں گے، اور ان امور کے پیش کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جمعیۃ علمائے ہند و خلافت کمیٹی کی وساطت سے مسلمانان ہند کا جو اثر سلطان ابن سعود پر ہے، وہ زائل ہو جائے گا اور جو کچھ اصلاح کی توقع ہے وہ جاتی رہے گی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمارے اس خط کو مولانا سید سلیمان ندوی کے ذریعہ سے وفد خلافت کو دکھا دیجئے، میں ان کو بھی انہی امور کے بابت خط لکھنا چاہتا تھا، مگر تنگی وقت مانع ہے۔

احمد سعید

مولانا المحترم دامت معالیکم

السلام علیکم۔ اعظم گڈھ کی چند روزہ صحبت میری زندگی کی بہترین یادگار ہے[1]، جی تو یہ چاہتا تھا کہ دار المصنفین کی عمارت ہی کو اپنے ہمراہ دہلی اٹھا لاؤں، تاکہ آپ جیسے مخلصین کی زیارت کا ہمیشہ شرف حاصل ہوتا رہے، آپ کی خاموش مساعی اور خدمت ملک و ملت موجب ہزار تحسین و آفرین ہے، خدا تعالیٰ آپ کی اس سعی کو مشکور و مقبول فرمائے، اور آئندہ آنے والی نسلوں کو اس ذخیرہ سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، جو آپ ان کے لیے جمع کر رہے ہیں، مولانا عبد السلام صاحب کی انتہائی خاموشی اور مولانا مسعود علی صاحب کی انتہائی شگفتگی نے دار المصنفین کی فضا میں ایک اعتدال پیدا کر دیا ہے، رفقائے دار المصنفین کی محنت و ایثار مجھ جیسے نالائق کے لیے موجب رشک و غبطہ ہے، آپ کے تمام رفقا بہترین رفقا ہیں، کاش یہ کسی کی درخواست پر مضمون لکھ دینے کے بھی عادی ہوتے، آخر میں جناب کے اخلاق کریمانہ اور میزبانہ، آرام و آسایش کا مخلصانہ شکریہ پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ جناب کا مزاج عالی مع الخیر ہوگا، جملہ پرسان حال کو عموماً اور بالخصوص مولانا مسعود علی صاحب اور مولانا عبد السلام صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، رفقائے دار المصنفین کی خدمت میں بھی سلام پہنچا دیں، حکیم محمد اسحاق صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، اگر سہیل صاحب تشریف لائیں اور ان کا دماغ صحیح ہو تو ان کی خدمت میں بھی سلام پہنچا دینے کا کچھ مضائقہ نہیں۔

خویدکم الافقر سعید

۳۰ اگست ۱۹۳۹ء
دہلی

محترم و مکرم حضرت سید صاحب ادام اللہ مجدکم

السلام علیکم۔ ہندوستان کے حالات و واقعات اس قدر تعجیل کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ کسی کے روکے رک نہیں سکتے، کانگریسی حکومتوں کا رویہ قابل اطمینان نہیں ہے، اور مسلمانوں کو ان حکومتوں کے طرز عمل سے عام شکایتیں پیدا ہو رہی ہیں، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک مخصوص اجتماع میں اس امر پر غور کیا جائے کہ مسلمانوں کو کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔

میں دو چار دن میں مجلس عاملہ کا ایک جلسہ طلب کر رہا ہوں، جس کی اطلاع آپ کی خدمت میں روانہ کی جائے گی، اس موقع پر عام ممبران کی یہ خواہش ہے کہ آپ ضرور شرکت فرمائیں، کچھ عرصہ سے آپ کی عدم توجہ کے باعث استفادہ سے محرومی ہے، جو ہمیشہ جمعیۃ علماء کے ارکان آپ کی ذات گرامی سے حاصل کرتے رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ مجلس عاملہ کے اس جلسہ میں جو ستمبر کے پہلے ہفتہ میں ہونے والا ہے، آپ ضرور تشریف لا کر اپنی رائے سے استفادے کا موقع دیں، میں آپ کے امید افزا جواب کا منتظر ہوں، ارباب ندوہ کی خدمت میں سلام مسنون۔

آپ کا مخلص
فقیر احمد سعید کان اللہ لہ

---

[1] مولانا کی متوضلع اعظم گڈھ کی ایک تقریر پر اعظم گڈھ میں مقدمہ چلا تھا، اس سلسلہ میں ان کا قیام دار المصنفین رہا تھا۔

۲۲ر مارچ ۴۱ء
دہلی

سیدنا المطاع زاد اللہ مجدکم علماً وحلماً

السلام علیکم - حضرت والا کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا، مسٹر عاصم کے خطوط سے بیگم صاحبہ اور بعض بچوں کی علالت کا حال معلوم ہوتا رہا، لیکن جناب کا کوئی گرامی نامہ ابتک موصول نہیں ہوا، نہ تشریف آوری کی صحیح تاریخ کا علم ہوا، نہ یہ معلوم ہوسکا کہ قیام کتنے دن ہوگا - اور یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ میاں سلمان ہمراہ ہوں گے یا نہیں؟

کل اخبارات میں اعظم گڈھ میں فرقہ وارانہ فساد کی خبر پڑھکر تشویش ہوئی، لیکن تفصیل نہ معلوم ہوسکی۔

میری حالت یہ ہے کہ جس دن سے آیا ہوں کچھ نہ کچھ بیمار ہوں، آج کل گلا ایسا آیا ہے کہ نہ بات ہوسکتی ہے اور نہ آسانی سے کچھ کھایا پیا جاسکتا ہے، جب افاقہ ہوتا ہے، اعظم گڈھ اور شبلی منزل کے احباب کو شکریے کے خطوط لکھتا ہوں، مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں اس وقت تک کوئی خط نہیں لکھ سکا ہوں، روز سوچتا ہوں کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں، مگر الفاظ میسر نہیں آتے۔ جب تک طبیعت کو افاقہ نہ ہو ان کو خط لکھنا مشکل ہے، چاہتا ہوں کہ خط ان کے ذوق کے موافق ہو، لیکن دماغ ہی حاضر نہیں -

گلا آجانا بظاہر تو معمولی مرض ہے، لیکن میں تو بہت ہی تکلیف محسوس کررہا ہوں،

خدا کرے آپ مع متعلقین بخیریت ہوں، میں شکر گزار ہوں گا اگر جناب والا چند سطور سے مجھے ممنون فرمائیں گے، تاکہ مجھے اطمینان ہو، اور میں بھی اپنا پروگرام بنا سکوں، اسمٰعیل کاکا مدراس سے تشریف لائے ہوئے ہیں اور خواجہ عبدالحئی صاحب کی تحویل میں ہیں۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۲ر اگست ۴۱ء
دہلی

سیدنا المطاع زادکم اللہ مجداً وشرفاً

السلام علیکم، گرامی نامہ کا شکریہ، یہ بالکل صحیح ہے کہ تکثیر روایت پیش نظر رہی، بعض احادیث کے ضعف کی تصریح کردی گئی ہے، غالباً تین مقامات پر اس قسم کی تصریح موجود ہے، جناب کو معلوم ہے الاتحافات السنیہ پر میری توجہ زیادہ مرکوز رہی، گر اعتماد سب سے زیادہ خطیرۃ التقدیس پر رہا، خطیرۃ التقدیس کو پورا کرنے کے بعد میں نے دوسری جانب توجہ کی، بہر حال آپ حضرات کی توجہ اور دعاؤں سے جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا، نواب سید علی حسن صاحب کا نام چونکہ معلوم نہ تھا اس لیے نہیں لکھا جاسکا، اگرچہ میں جانتا تھا کہ ابوالنصر علی حسن ان کے صاحبزادے ہیں، مگر یہ کوتاہی ہوگئی، اگر میری زندگی میں دوسرے اڈیشن کی نوبت آئی تو انشاء اللہ اس کی تلافی کردی جائے گی،

مسٹر عاصم کا عرصہ سے خط نہیں آیا نہ ان کے امتحان کا نتیجہ معلوم ہوا، ایم اے پاس ہوگئے؟ کس درجہ میں پاس ہوئے، بہر حال آپ کا انتخاب قابل ستائش ہے، خدا تعالیٰ انجام بخیر کرے مسٹر عاصم خدا کے فضل سے بہت شریف الطبع نوجوان ہیں، کیا چھوٹی صاحبزادی کی بھی شادی ہورہی ہے؟،

میاں سلمان کے ندوے میں داخل ہونے پر مبارکباد قبول کیجئے، اللہ تعالیٰ ان کے علم وفہم میں ترقی عطا فرمائے، اور میاں سلمان کو آپ کی صحیح جانشینی کا فخر حاصل ہو،

رفقاء دارالمصنفین کی خدمت میں سلام مسنون بالخصوص مولانا مسعود علی صاحب ندوی، امام صاحب، مولوی عبدالسلام صاحب، شاہ صاحب، پروفیسر صاحب سے میرا سلام کہدیجئے - خدا جانے پی ایچ ڈی کہاں ہیں؟

من خویدکم الاحقر فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۳ اپریل ۱۹۶۵ء
موتمر المصنفین دہلی

سیدنا المکرم دامت معالیہم السلام علیکم

عرصہ کے بعد جناب کا گرامی نامہ موجب مسرت ہوا، پہلے کبھی کبھی میاں عاصم اور سہیل آنکلتے تھے، تو شبلی منزل کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، لیکن اب کچھ عرصہ سے انکا بھی پتہ نہیں، خدا جانے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

حضرت والا! مجھپر ایک عرصہ سے ایک خاص مرض کا تسلط ہے جس نے مجھے صاحب فراش بنا دیا ہے، سوءِ ہضم روز افزوں، دماغ کمزور ہو گیا ہے، ریاحی بواسیر نے قلب اور معدے کے دوروں کی شکل اختیار کر لی ہے، ہر وقت اختلاجی کیفیت رہتی ہے، تقریباً ۲ سال سے نہ کوئی سفر کیا ہے اور نہ کہیں جلسہ میں تقریر، شہر میں کہیں چلا جاتا ہوں تو بیٹھے بیٹھے دس پانچ منٹ کچھ کہہ دیتا ہوں، ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کب دورہ پڑ جائے، امراض کا تداول ہوتا تو کیفیات میں تبدیلی ہوتی رہتی، اور میں یہ عرض کر سکتا کہ فلاں مرض کی حالت میں حاضر ہو جاؤنگا، لیکن ایک ہی مرض نے ایسے پاؤں جما لیے ہیں کہ گویا گھر بنا لیا ہے، زندہ ہوں مگر زندگی کی لذتوں سے محروم ہوں۔ مولوی مسعود علی صاحب کا سفارش نامہ سرائمیر کے سلسلے میں آیا تھا، لیکن نہ سرائمیر والوں نے مجھے دیکھا اور نہ مولوی مسعود علی صاحب نے ملاحظہ فرمایا، اگر یہ لوگ دیکھتے تو ایک عجیب حالت دیکھتے، اور خود مجھکو مشورہ دیتے کہ تو سفر سے احتراز کر۔ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کے زیر علاج ہوں، وہ توبات کرنے اور ترجمہ کا کام کرنے سے بھی منع فرماتے ہیں، مگر خیر انکی ہدایات پر عمل ناممکن ہے، تھوڑے تھوڑے کچھ کام موتمر المصنفین کا کرتا رہتا ہوں، مرض ایسا نہیں جو قابل افاقہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو میں یہ کہہ سکتا تھا کہ جس دن میں یا مہینہ بھر میں حاضر ہونگا، مگر مرض کی حالت تو تقریباً یکساں ہے۔

یہ مختصر سی رُوداد زندگی ہے، جو نہایت افسوس اور ندامت و شرمندگی کے ساتھ لکھ رہا ہوں، اور یہ غم ہے کہ میں تعمیل حکم سے کس طرح قاصر ہوں، ورنہ آپ کی سفارش کو تو میں کالمر الواللہ لا ینہ سمجھتا ہوں۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔

آپ حضرات کی دعاؤں کا طالب ہوں، خدا کو صحت دیتے دیر نہیں لگتی، اگر اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے صحت عطا فرمائے تو مجھے تعمیل حکم سے کیا عذر ہو سکتا ہے، بہرحال میں جناب سے مکرر عذر کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔

شبلی منزل کے تمام اکابر اور احباب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔ ایک جوابی لفافہ بھی موصول ہوا ہے، جسکی قیمت حیرت و استعجاب کے ساتھ اسی لفافہ میں بھیج رہا ہوں۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہ

مطبوعات جدیدہ

مقدمۃ فی النحو (عربی)۔ از خلف الاحمر، صفحات ۱۲۲، ٹائپ اعلیٰ، ناشر وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، دمشق (شام)

نحو کے قواعد سب سے پہلے ابو اسود دؤلی نے ترتیب دیے، پھر اس کے بعد بیشمار ائمہ فن نے اسے ترقی دی، دوسری صدی ہجری اس فن کے شباب کا زمانہ تھا، اور اس میں بڑے بڑے ائمہ نحو پیدا ہوئے اور بڑی مفصل و مطول کتابیں اس فن پر تصنیف ہوئیں، انہی ائمہ نحو میں ایک ممتاز امام نحو خلف الاحمر البصری بھی ہے، جس نے نحو کی یہ مختصر مگر جامع کتاب تصنیف کی، جو ابتک ناپید تھی، عبد العزیز میمن صاحب نے اس کا ایک قلمی نسخہ فروق (ٹرکی) میں دیکھا جسکی طرف شام کی وزارت ثقافت وارشاد کو متوجہ کیا، چنانچہ وزارت مذکور نے علم دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا فوٹو لیکر شائع کرنے کا اہتمام کیا، چونکہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں تھا، اس لیے اس کے مرتب و محشی عزالدین تنوخی کو جہاں جہاں شبہہ ہوا، عرب ملکوں اور خاص طور سے مصر کے نحاۃ سے رجوع کے بعد پوری تحقیق سے اس کی تصحیح کی ہے،

نحو کی مختصر کتابوں میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو دوسری صدی ہجری میں تصنیف ہوئی، خلف الاحمر اس فن کا امام ہی تھا، اس لیے کتاب کی زبان انتہائی صاف اور مباحث بہت مرتب ہیں، اسم، فعل اور حرف کی تقسیم کے بعد سب سے پہلے حروف پر بحث کی ہے، وہ "حروف" کا لفظ اصطلاحی معنی کے ساتھ کلمہ اور عام معنی میں بھی استعمال کرتا ہے، کتاب درس میں داخل کرنے کے قابل ہے۔

اقبال اور سیاست ملی

از رئیس احمد جعفری ندوی، صفحات ۵۰۰، کتابت وطباعت متوسط، ناشر اقبال اکیڈمی، کراچی۔ قیمت ہے/

اقبال اول و آخر شاعر اور فلسفی تھے، اور یہ دونوں خارزار سیاست میں اپنا دامن الجھانا پسند نہیں کرتے، مگر اقبال نرے شاعر اور فلسفی نہیں تھے، بلکہ وہ اپنے سینہ میں ایک دلِ دردمند بھی رکھتے تھے، اور اپنے اسی دلِ دردمند کی نوا ہائے دروں کے اظہار کے لیے انھوں نے شاعری اور فلسفہ کا سہارا لیا تھا، اس لیے ہندوستان کی سیاست میں جو مدوجزر ہوتا تھا، اس سے وہ اثر لیے بغیر نہیں رہتے تھے، خاص طور پر وہ مسلمانوں کے سیاسی زوال اور دینی بے حسی سے بے حد متاثر تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان موجودہ سیاست میں دوسروں کے زلہ ربا نہ بنیں، بلکہ دنیا کے سامنے اس پیغامِ حیات کے داعی بنیں، جو ان کی تخلیق کا مقصد وحید ہے۔

علامہ اقبال کا عہد خاص طور پر ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۵ء یعنی جنگ بلقان سے وفاقی حکومت کے قیام کے درمیان کے زمانہ میں ہندوستان میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات ہوئے، یہی زمانہ ہے جس میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری، ملی جذبہ اور اپنی انفرادیت کا احساس پیدا ہوا، علامہ اقبال جنھوں نے اس احساس کے پیدا کرنے میں خود حصہ لیا تھا، سیاسی اعتبار سے جب بھی اس پر کوئی زد پڑتی تھی، وہ متاثر ہوتے تھے، چنانچہ انھوں نے پنجاب اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے گول میز کانفرنس کے رکن کی حیثیت سے سائمن کمیشن کے معاون اور نہرو رپورٹ کے مخالف کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لیا اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس کتاب میں اقبال کی اسی حیثیت کو ان کے خطوط اور واقعات سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امام الہند

از ابوسلمان ہندی، صفحات ۳۸۶، کتابت وطباعت معمولی، ناشر مکتبہ اسلوب، کراچی، قیمت ستے

اس کتاب میں مولانا آزاد کے سوانح حیات کے ساتھ ان کے افکار و خیالات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، ہندی صاحب مولانا آزاد کے بڑے پرجوش عقیدت کیش ہیں، اس لیے پوری کتاب میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جو باتیں انکے ذہن میں مولانا آزاد کی بلند شخصیت کو مجروح کرنے والی تھیں، ان سب کا دفاع کیا ہے، مثلاً یہ بات کہ مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد تھے، مولانا آزاد کی شاگردی سے مولانا شبلی کی عظمت میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ مولانا آزاد کی تعمیر افکار میں مولانا شبلی کی علمی صحبتوں کا بھی دخل تھا تو اس سے مولانا آزاد کی شخصیت کی بلندی میں کوئی فرق نہیں آتا، مگر مرتب نے اسکی تردید کے لیے بیسیوں صفحے سیاہ کرنا ضروری سمجھا، کتاب کا ماخذ زیادہ تر ملیح آبادی کی مولانا آزاد کی کہانی خود انکی زبانی ہے، اسلیے اس میں نئے مباحث کم ہی ملتے ہیں۔

وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول

مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب، صفحات ۱۴۴، کتابت وطباعت بہت معمولی، ناشر تصوف سوسائٹی سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد ۲/

ہندوستان میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے احیائے شریعت اور اتباع سنت کا جو چراغ جلایا تھا، اسے ان کے خانوادہ نے صدیوں نہ صرف روشن رکھا بلکہ اس کی لو کو اور زیادہ تیز کردیا۔

این خانہ ہمہ آفتاب است

اسی خانوادہ کے ایک وسیع الفیض شیخ محمد نقشبند ثانی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت مجددؒ کے پوتے اور خواجہ محمد معصومؒ کے منجھلے صاحبزادے تھے، اپنے دادا اور والد کی طرح انھوں نے بھی اپنے متوسلین، بادشاہ وقت اور بہت سے امراء و رؤسا کو خطوط کے ذریعہ احیائے شریعت، تعلق باللہ

اور اتباع سنت کی ترغیب دی ہے، اور ان کو اس دور کے کفر والحاد سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے، خود عالمگیرؒ کو انھوں نے متعدد نصیحت آمیز خطوط لکھے ہیں، ان کے ان خطوط کے پڑھنے سے پتہ چلے گا کہ دوسرے مغل بادشاہوں کے مقابلہ میں عالمگیر کے اندر جو غیر معمولی دینی احساس تھا وہ اسی خانوادۂ مجددیہ کا فیض ہے،

اس کی اشاعت پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سندھ یونیورسٹی بھی قابل مبارک باد ہے، اس کتاب کا نام تاریخی ہے، یعنی اس سے ۱۱۱۵ھ تاریخ نکلتی ہے۔

مقالات امینی - از مولانا محمد تقی امینی صاحب، صفحات ۸۴، کتابت، طباعت عمدہ ادارۂ علم و عرفان، اللہ رکھا بلڈنگ (اجمیر)

مولانا تقی امینی صاحب کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تھیالوجیکل سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں اسلامی فقہ پر اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا تھا، مولانا نے اس موقع پر تین مقالے پیش کیے جو پسند کیے گئے، انہی مقالوں کو مقالات امینی کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے، پہلا مقالہ اجتہاد پر اور دوسرا تیسرا تدوین فقہ اور فقہ کے اجتماعی مسائل پر ہے،

تینوں مقالوں کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ شریعت اسلامی حالات کے مطابق اجتماعی مسائل کے حل کرنے میں درماندہ نہیں ہے، البتہ جس طرح ہر قانون کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں جو حالات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ حالات کو وہ اپنا تابع بناتے ہیں، بالکل یہی صورت اسلامی شریعت کی بھی ہے، اس نے اپنے مبادی اور بنیادی اصولوں کو باقی رکھتے ہوئے ہمیشہ اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے،

امید ہے کہ یہ مقالے اہل علم میں شوق سے پڑھے جائیں گے اور جن مسائل پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ان پر وہ سنجیدگی سے غور کریں گے۔

"م، ج"

جلد ۹۳ - ماہ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۴ء - عدد ۶

فہرست مضامین